سبق آموز کہانیاں

محمد الدین فوق

ظفر برادرس تاجران کتب ظفر منزل لاہور کا سلسلہ تالیفات ۲۵
سرینگر کشمیر

سبق آموز کہانیاں

جو بچوں میں شرافت و شجاعت نیکی و پاکیزگی۔ ہمت و استقلال۔ فرماں برداری و خودداری اور اعلےٰ اخلاق کے جوہر پیدا کرنے کے لئے دنیا کے مختلف نتیجہ خیز تاریخی واقعات سے جمع کی گئیں

مصنفہ
محمد الدین فوق

سنہ ۱۹۳۵ء مطابق سنہ ۱۳۵۴ھ موافق سمبت ۱۹۹۲
بار اول تعداد جلد ایک ہزار ۱۰۰۰ قیمت فی جلد ۶ر

فہرست مضامین

تمہید

یہ کتاب[1] دراصل ۱۹۲۷ء کی تصنیف ہے۔ لیکن اتفاق سے اس کا مسوّدہ ۱۹۳۴ء تک نظروں سے اوجھل رہا۔ اور پھر اس کا خیال بھی نہ رہا ✦

۱۹۳۵ء کے موسم سرما میں کاغذات کی چھان بین کرتے ہوئے چند دوسرے مسوّدوں کے ہمراہ یہ مسوّدہ بھی دستیاب ہو گیا۔ اب بعض کہانیاں اس میں پرانی ہی رہنے دی گئی ہیں۔ اور چند ایک پرانی کہانیوں کی جگہ نئی کہانیاں اور نئے واقعات درج کئے گئے ہیں ✦

یہ صحیح ہے۔ کہ یہ چھوٹی سی کتاب لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ایک اخلاقی معلّم کا کام دیتی ہے۔ لیکن اس نصیحت آمیز کتاب کے مطالعہ سے عام لوگوں کی عقل بھی عقل کل۔ ان کا ذہن۔ ذہن رسا اور فہم نکتہ رس ہو جاتا ہے ✦ یقین ہے۔ کہ ہمارے بچوں کے لئے جو حقیقتاً آئندہ نسلوں کی بنیاد ہیں مخرب اخلاق افسانوں اور ناولوں کی بجائے اس قسم کا پاکیزہ لٹریچر بہت مفید ہو گا ✦

توقع ہے۔ کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد ایک اور چھوٹی سی کتاب بچوں کے لئے زیور طبع سے آراستہ کی جائیگی۔ جس میں ان کی اخلاقی تعمیر کی بنیاد کو پختہ بنانے ان میں ملک کی حقیقی محبّت مستحکم کرنے اور وطن کی مختلف اقوام کو اتحاد و اتفاق کی تعلیم دینے کے لئے اعلیٰ درجہ کی موثر اور دل نشین نظمیں درج ہونگی ✦

۳۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء
محمّد الدین فوق

[1] اس کا ٹائیٹل یعنی سرورق ۱۹۲۷ء ہی کا طبع شدہ ہے۔

مہمان نواز کی شرافت

آج سے کئی سو برس پہلے مسلمان خلفاء (بادشاہوں) میں ایک خاندان تھا بنی امیّہ۔ جب یہ خاندان تباہ ہوا۔ اور سلطنت دوسرے خاندان میں چلی گئی۔ تو جن لوگوں نے بنی امیّہ کا ساتھ دیا تھا۔ ان کے لئے بڑی مشکل ہوئی۔ اسی نمک خوار اور شریف طینت گروہ میں ایک شخص ابراہیم بھی تھا۔ جو دشمنوں سے چھپتا پھرتا تھا۔ یہ بڑا خوش تقریر چلبلا اور مزہ کا آدمی تھا۔ اور انہیں صفات نے انقلاب سلطنت کے زمانے میں اس کی جان بچائی ابراہیم نے بے دھڑک دربارِ خلافت میں آکر امان مانگی اور خلیفہ نے اسے روزانہ دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔

ایک دن خلیفہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ ابراہیم ادب کے ساتھ سامنے کھڑا تھا۔ سفاح (خلیفہ) نے کہا۔ ابراہیم اپنی خاموش زندگی کا کوئی واقعہ سناؤ۔ ابراہیم نے آداب بجا لانے کے بعد کہنا شروع کیا:۔

امیرالمومنین!

ایک دن میں پریشانی کے عالم میں اپنی جان بچانے کے لئے چھپا بیٹھا تھا۔ کہ میں نے چند آدمیوں کو دیکھا۔ جو کوفے سے اجیرہ جا رہے تھے۔ میں نے خیال کیا۔ کہ یہ

ضرور مجھے گرفتار کرنے کے لئے آئے ہیں۔ یہ سوچتے ہی میں وہاں سے بے حواس ہو کر بھاگا۔ اور پریشانی میں بدقسمتی سے راستہ بھول گیا۔ اور برباد و تباہ کوفہ میں داخل ہو گیا۔ اور جب مجھے معلوم ہوا۔ کہ میں کوفے میں ہوں۔ تو میری جان نکل گئی۔ کیونکہ کوفے کا ذرہ ذرہ میرے خون کا پیاسا تھا۔ اس خیال کے بعد کہ اب میں ضرور گرفتار ہو جاؤں گا۔ میں نے اپنی زندگی خدا کے سپرد کر دی۔ تاہم حضور میرا دل پریشانی سے بیٹھا جاتا تھا۔ اور طبیعت سہمی جاتی تھی۔ آخر کار میں اسی حالت سے ایک تاریک اور تنگ گلی میں داخل ہوا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک عظیم الشان محل سا نظر آیا۔ جس کے دروازہ پر ایک نوجوان شہزادوں کا سا لباس پہنے اپنے چند غلاموں کے ساتھ کھڑا تھا میں اس کا کرو فر اور رئیسانہ ٹھاٹ دیکھ کر سہم گیا۔ مجھ پر نزع کا سا عالم طاری ہو گیا۔ میں نہ واپس ہو سکتا تھا۔ نہ اتنی جرأت تھی۔ کہ آگے بڑھوں۔ مگر یہ خیال کر کے کہ کہیں اس کشمکش کا نتیجہ خراب نہ ہو۔ میں ہمت کر کے آگے بڑھا اور تھرتھراتا ہوا اس امیر کے سامنے ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی ہنس کی سی گردن اٹھا کر کہا:۔

"تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟"

میں نے گڑگڑاتے ہوئے عرض کیا۔ کہ "پناہ کا طالب ہوں" نوجوان امیر نے میری طرف ایک مستغنی نظر سے دیکھا اور کہا۔ اچھا تم اس وقت سے میری پناہ میں ہو۔ اور پوشیدہ رہ سکتے ہو۔ میں اس کے ساتھ عالی شان محل میں داخل ہوا۔ اور ایک بڑی مدت تک امن اور سکون کی زندگی گزارتا رہا۔ لیکن اُس نوجوان نے کبھی مجھ سے میرا حال نہ پُوچھا۔ وہ روز صبح گھوڑے پر سوار ہوکر محل سے نکل جاتا۔ اور شام کو تھکا ماندہ پھر محل میں واپس آجاتا۔ میرے دل میں اُس کے اس پروگرام سے مختلف خیال دل میں آتے۔ ایک بڑی مدّت تک کانٹے کی سی خلش میرے دل میں رہی کہ یہ واقعہ کیا ہے۔ میں اُس سے جب دریافت کرنا چاہتا۔ تو اُس نوجوان کا رئیسانہ وقار اور امیرانہ رُعب و داب مجھے پوچھنے کی اجازت نہ دیتا۔ اور پھر یہ بھی خیال کرتا۔ کہ کہیں اپنا راز نہ کھُل جائے۔ ڈرتے ڈرتے ایک دن میں نے اس نوجوان سے عرض کیا:۔

میرے معزز محسن! آخر آپ آجکل اتنے کیوں پریشان ہیں۔ ایسا کونسا واقعہ ہے۔ جس نے حضور کو اتنا ستا رکھا ہے۔ اگر کچھ نقصان نہ ہو۔ تو مجھے بھی اپنے حال سے آگاہ فرمائیے۔

اے امیرالمومنین! اُس شکیل نوجوان نے میری زبان

سے ہمدردانہ الفاظ سُن کر اپنی خوبصورت گردن اٹھائی۔
اور کچھ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اصرار کیا۔ تو اُس نے
کہنا شروع کیا:۔

"تو ابراہیم کو جانتا ہے۔ جو بنی اُمیہ کے زمانے میں
ایک بڑا آدمی تھا اور جو اب امیر سفّاح کے خوف
سے لرز لرز کر بھاگا پھرتا ہے۔ وہی ابراہیم دراصل میرے
باپ کا قاتل ہے۔ میں اس سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔
چونکہ اس سے اچھا موقع انتقام کا ہو نہیں سکتا۔ روز اس
کی تلاش میں جاتا ہوں۔ لیکن مُوذی کا پتہ نہیں چلتا۔
جس وقت میں نے اس نوجوان کی زبان سے یہ الفاظ
سُنے۔ میرا بال بال کانپ گیا۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خون
خشک ہو گیا۔ میں نے اپنے حواس کو بہت جلد درست
کیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں ابھی موت نہ نصیب ہو جائے۔
اور نوجوان مجھے تاڑ نہ لے۔ میں اپنی جگہ سے ذرا آگے بڑھا۔
اور میں نے عرض کیا:۔

میرے محسن! میں ابراہیم کو جانتا ہوں۔ اچھی طرح جانتا
ہوں۔ اور مجھے معلوم ہے۔ کہ وہ اس وقت کہاں پوشیدہ ہے
امیر کا چہرہ مسرت سے چاند کی طرح چمکنے لگا۔ وہ
اٹھا۔ اور مجھ سے بغلگیر ہوا۔ اور ایک اضطراب کے ساتھ
ہٹ کر مجھے غور سے دیکھنے اور انتظار کرنے لگا۔ کہ میں اُسے
کیا بتاتا ہوں۔ میں نے بھرّائی اور رُکتی ہوئی آواز میں پھر

کہا۔ کہ ابراہیم آپ کے بہت قریب ہے۔ امیر چمک کر تیزی سے اُٹھا۔ اور اُس نے بڑی بے تابی سے کہا۔ میرے عزیز دوست جلد بتاؤ۔ ابراہیم کہاں ہے؟ امیر کا یہ اضطراب دیکھ کر میں پیچھے کی طرف ہٹ گیا۔ اور میں نے کہا میرے کریم! لے دیکھ وہ ابراہیم "میں" تیرے سامنے کھڑا ہوں اور بے شک میں تیرے باپ کا قاتل ہوں۔

امیر کا چہرہ مایوسی سے زرد ہو گیا۔ اس نے مجھے تعجب سے دیکھا۔ اور آرام سے مسند پر بیٹھ گیا۔ اس وقت میں موت اور زندگی کی تاریک روشنی میں ساکت کھڑا تھا۔ کہ وہ نوجوان غضب کو ضبط کرتے ہوئے اور میری طرف سے منہ پھیرتے ہوئے اٹھا۔ اُس نے انگلی سے اشارہ کیا اور کہا:۔

ابراہیم! قیامت میں خدا کے سامنے میرا باپ تجھ سے اپنے قتل کا عوض لیگا۔ میں آج تجھے قتل کر کے مہمان نوازی کے اُس بڑے قیمتی ثواب کو اپنے ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا۔ جو تجھے قیامت میں ملے گا۔ اس لئے یہ تھیلی جس میں پانچ سو دینار ہیں۔ اور جو تجھے سفر میں کام دے گی لے۔ اور میرے پاس سے چلا جا۔ ممکن ہے تو میرے پاس رہے۔ اور میں کسی وقت تیرے قتل پر آمادہ ہو جاؤں۔
یہ کہہ کر وہ اپنی مسند پر بیٹھ گیا۔ اے امیر المومنین! میری حالت عجیب تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میں پتھر کا ایک بُت ہوں

جو اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ میں چاہتا تھا۔ کہ چلا جاؤں۔ لیکن نہیں جا سکتا تھا۔ نوجوان امیر کی دوسری آواز نے میرے سکوتِ عظیم کو توڑا۔ میں نے تھیلی اٹھائی۔ اور روانہ ہو گیا۔

خلیفہ یہ سُن کر بہت خوش ہوا۔ ابراہیم کے حوصلے اور اُس نوجوان امیر کی شرافت کی تعریف کی۔

"مہمان نوازی دنیا میں بڑی شرافت ہے"۔ دنیا کے بڑے بڑے رشی۔ مہاتما۔ رسول۔ پیغمبر سب بڑے مہمان نواز تھے تم بھی ہمیشہ مہمان نواز بنو۔ دشمن بھی اگر مہمان ہو۔ تو اُسے دوست سمجھو۔ چونکہ بے نفسی ہی کا دوسرا نام مہمان نوازی ہے

کرشن جی اور سُداماں

کرشن اور سداماں دونوں ایک ہی پاٹھ شالا میں پڑھتے تھے۔ سداماں ایک غریب برہمن کا لڑکا تھا۔ اور کرشن جی دوارکا کے راجکمار تھے۔ پڑھنے لکھنے کے زمانے میں ان دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ کرشن جی سداماں کی بڑی عزت کرتے تھے اور سداماں کو بھی کرشن جی سے بڑی محبت تھی۔ کرشن جی تو پڑھ لکھ کر اور بڑے ہو کر دوارکا کے راجہ بن گئے۔ لیکن سداماں بیچارہ غریب کا غریب ہی رہا۔ سداماں کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ بیوی بچوں کے ساتھ ایک جھونپڑی میں دکھ درد کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ کھانے کے لئے جو کچھ مل

جاتا۔ ہنسی خوشی بیوی بچوں کو کھلاتا اور خود کھا لیتا۔ اور آئے
دن تو اُسے فاقوں ہی کا سامنا کرنا پڑتا۔ حالانکہ وہ ایک
بڑا زبردست پنڈت تھا۔

ایک دن اُس کی جھونپڑی میں کھانے کے لیئے کچھ
نہ تھا۔ سداماں محنت مزدوری کی فکر میں گھر سے نکلا
لیکن کہیں کوئی کام نہ ملا۔ ناچار گھر میں واپس آیا۔ تو
اُس کی دُکھیا بیوی نے کہا :۔ تم نے اکثر مجھ سے کہا ہے
کہ کرشن جی ہمارے بچپن کے دوست ہیں۔ اُن کے
پاس جاؤ۔ وہ یقیناً تمہاری مدد کریں گے۔

غیرت مند سداماں نے کہا۔ ہاں وہ میرے بڑے دوست
ہیں۔ لیکن مجھے کسی سے کچھ مانگتے ہوئے شرم سی آتی
ہے۔ بیوی بار بار سداماں کو کرشن جی کے پاس جانے
کے لئے مجبور کرتی تھی۔ لیکن سداماں کی غیرت کسی طرح
قبول نہ کرتی تھی۔ کہ وہ کرشن جی کے سامنے ہاتھ پھیلائے
وہ اپنے پرماتما پر سہارا لگائے بیٹھے رہے۔ جب بیٹھے
بیٹھے تین فاقے گذر گئے۔ تو بیوی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔
کہ "پرماتما کے لئے جاؤ۔ دیکھو چھوٹا لڑکا بلک رہا ہے"۔

سداماں کی غیرت کا تقاضہ تو اب بھی یہ نہ تھا۔ کہ
بیوی کا کہا مان لیں۔ لیکن معصوم آتما کی بے کسی پر آنسو
نکل پڑے۔ اور آخر کرشن جی کے پاس جانے کے لئے تیار
ہو گئے۔ دوارکا پہنچ کر کرشن جی کے محل کے دروازہ پر

آکر دربان سے کہا۔ کہ مہاراج سے جا کر عرض کرو۔ کہ آپ کا بچپن کا دوست سداماں آپ سے ملنے کیلئے حاضر ہوا ہے۔ دربان نے سداماں کے الفاظ اور لباس سے خیال کیا۔ کہ یہ شخص کیونکر کرشن جی کا دوست ہو سکتا ہے۔ لیکن کرشن جی کی ڈیوڑھی سے کسی کو واپس کر دینے کا حکم نہ تھا۔ اس لئے سداماں کو وہیں چھوڑ کر دربان کرشن جی کے پاس گیا۔ اور یہ واقعہ کہہ دیا۔ کرشن جی نے سُنا۔ سُنتے ہی دوڑے اور آکر سداماں کو گلے لگا لیا اور اپنی بے اندازہ محبّت کا ثبوت دیا۔ محل میں لے جا کر سداماں کو تخت پر بٹھایا۔ اور خود نوکروں کی طرح خدمت کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد سداماں کو نہلایا۔ اچھی پوشاک پہنائی۔ کھانا کھلایا۔ اور آرام کرنے کے لئے چارپائی پر ایک قیمتی بستر کر دیا۔

اسی طرح سداماں کو کرشن جی کے ہاں بہت دن گُذر گئے۔ آخر ایک دن دُکھیا بیوی اور بے کس بچوں کے خیال نے بے چین کر دیا۔ اور دل میں واپس جانے کا پورا ارادہ کر کے کرشن جی سے کہا۔ اب مجھے ضرور گھر جانا چاہئے پرماتما جانے اُن کا کیا حال ہوگا؟

کرشن جی نے ہنسی خوشی اجازت دے دی۔ مگر کچھ دینے دلانے کا نام نہ لیا۔ غریب سداماں خاموش گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور دل میں سوچنے لگا۔ کہ اب پھر

اُسی مصیبت بلکہ اُس سے زیادہ مصیبت کا سامنا ہوگا۔ بیوی بچوں کی کیا حالت ہوگی؟ میری تو کرشن جی نے بڑی خاطر کی۔ لیکن میں جس لئے آیا تھا۔ وہ تو کچھ بھی نہ ہوا +

انہیں خیالات میں غوطے لگاتا ہوا سُداماں اپنے گھر پونچ گیا۔ دیکھا تو جھونپڑی کی جگہ ایک عظیم الشان محل بنا ہوا تھا۔ سُداماں کا دل دھک سے ہو گیا۔ اُس نے خیال کیا۔ کہ کسی کمبخت امیر نے اُس کے بیوی بچوں کو نکال یا ہلاک کر کے اُس کی جھونپڑی کی جگہ محل تیار کر لیا ہے۔ مگر اُس نے اسی سوچ کے ساتھ محل کے دروازے پر جا کر ایک نوکر سے دریافت کیا۔ کہ یہ محل کس کا ہے؟ نوکر نے کہا۔ "سُداماں جی کا"۔ سُداماں یہ الفاظ سُن کر بے حد متعجب اور بڑا حیران ہوا۔ محل کے اندر جا کر دیکھا تو غریب بیوی رانی اور بے کس بچہ راجکمار بنا ہوا مُسکرا رہا تھا +

سُداماں اب سمجھا۔ کہ دو تین مہینے کرشن جی نے اُسے کیوں مہمان رکھا۔ صرف اس لئے کہ اُس کی عدم موجودگی میں جھونپڑی محل اور ایک فاقہ کش عورت رانی اور ایک بے کس معصوم بچہ راجکمار بن جائے +

"سچ ہے۔ دوستی اسی کا نام ہے۔ انسانی ہمدردی اور دوستی کا سبق کرشن جی سے سیکھو۔ اور غیرت د

"شرافت کا درس سُدا ماں سے لو - غیرت انسانی شرافت کا دوسرا نام ہے - اور "دوستی" ہمدردی اور محبّت کا پاکیزہ عنصر ہے"

چیونٹی اور شہنشاہ تیمور

بچّو! آج ہم تمہیں ایک سچّا اور مزیدار قصّہ سُناتے ہیں - بادشاہ تیمور لنگ کا نام شاید تم نے سُنا ہوگا - تیمور لنگ ایک مُلک پر چڑھائی کرتے کرتے تھک گیا تھا - مگر وہ مُلک کسی صورت سے فتح نہ ہوتا تھا - تیمور اب بالکل نا امید ہو گیا تھا - اور ہمّت ہار بیٹھا تھا - کوئی صورت اب اُسے کامیابی کی نظر نہ آتی تھی - اور بار بار ناکامیاب رہنے سے شرمندگی اُسے الگ تھی - اسی فکر اور پریشانی میں ایک حوض کے کنارے بیٹھا تھا - اُس کے چند درباری بھی اُس کے پاس بیٹھے تھے - اور وہ ہر صورت سے اُس کا غم و فکر دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے - لیکن تیمور کے دل سے کسی طرح یہ فکر اور غم دور نہ ہوا - اور وہ برابر اُسی طرح سر جُھکائے ہوئے غمگین بیٹھا رہا - اتفاق سے اُس کی نظر حوض میں ایک چھوٹی چیونٹی پر پڑ گئی - کیا دیکھتا ہے - کہ وہ چیونٹی حوض کے پانی پر تیر رہی ہے - بہت کوشش کر کے حوض کے کنارے پر آتی ہے - اور حوض سے باہر نکلنے کا

ارادہ کرتی ہے۔ تھوڑی دُور دیوار پر چڑھتی ہے۔ پھر حوض میں گر پڑتی ہے۔ پھر بیچاری ہاتھ پاؤں مار کر حوض کے کنارے پہونچ کر کچھ دور دیوار پر چڑھتی ہے۔ مگر پھر حوض میں جا گرتی ہے۔ تیمور کو اس چیونٹی کا یہ حال دیکھتے دیکھتے بہت دیر ہو گئی۔ اور تیمور اُس کو بہت غور اور دلچسپی کے ساتھ دیکھتا رہا۔ کہ کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ چیونٹی بھی ہمت کی پکی تھی۔ اپنی کوشش کو اُس نے نہ چھوڑا۔ چڑھتی تھی۔ اور گرتی تھی۔ پھر بیچاری بڑی کوشش و محنت سے چڑھتی تھی پھر گر جاتی تھی۔ مگر اُس کے دم خم اور ہمت میں ذرا بھی کمی نہ آتی تھی۔ اور بس اپنی اسی دُھن میں لگی ہوئی تھی۔ تین چار مرتبہ تو ایسا ہوا۔ کہ دیوار کے سرے پر پہونچ گئی۔ اور باہر نکلنے میں ذرا سی ہی کسر باقی رہ جاتی تھی مگر پھر بیچاری حوض میں جا پڑتی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس چیونٹی کو ذرا بھی خیال اور ملال نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ گرتے ہی فوراً باہر نکلنے کی کوشش میں لگ جاتی تھی۔ تیمور برابر یہی تماشا دیکھتا رہا۔ اُس کے درباریوں کو بالکل معلوم نہ تھا۔ کہ کیا قصہ ہے۔ اور تیمور کس بات پر غور کر رہا ہے۔ وہ یہ ہی سمجھے۔ کہ بادشاہ ابھی رنج اور پریشانی میں مبتلا ہے۔ انھوں نے بار بار بادشاہ کو سمجھانے اور خوش کرنے کی کوشش کی۔ مگر بادشاہ نے اُنکی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ اور برابر غور سے اُس چھوٹی چیونٹی کی

طرف ہی دیکھتا رہا۔ آخر کار تیمور کیا دیکھتا ہے۔ کہ وہ چیونٹی ایک مرتبہ دیوار کے اوپر پونچ ہی گئی۔ اور باہر نکل آئی۔ تیمور یہ دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑا۔ اُس کا سارا فکر و غم دُور ہو گیا۔ اُس کی ناامیدی جاتی رہی۔ اور اپنے درباریوں سے وہ کہنے لگا۔ کہ بار بار کی ناکامیابی نے مجھے بالکل ناامید کر دیا تھا۔ میں بالکل ہمّت ہار چکا تھا۔ لیکن ابھی مجھے ایک چھوٹی سی چیونٹی نے کامیابی کا سچا بھید بتا دیا ہے۔ اُس نے اُس چیونٹی کا تمام واقعہ اپنے درباریوں کو سُنایا۔ اِس کے بعد وہ پھر اپنی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ اور آخر کار اُس مُلک کو فتح کر کے چھوڑا۔

پیارے بچّو! تم بھی اُس چھوٹی چیونٹی سے سبق حاصل کرو۔ ہمّت اور کوشش عجب چیز ہے۔ اگر وہ چیونٹی تھک جاتی۔ اور ہمّت ہار جاتی۔ تو کبھی حوض سے باہر نہ نکلتی۔ اور وہاں ہی مر جاتی۔ اور پھر اُس کی نہ تھکنے والی ہمّت نے تیمور کو جو سبق پڑھایا۔ یہ اُسی کا نتیجہ تھا۔ کہ اُس نے چیونٹی کی ہمّت دیکھ کر۔ اپنی ہمّت قائم کی۔ اور آخر وہ مُلک فتح کر لیا۔ جس کے فتح کرنے سے وہ بار بار ناکام رہ چکا تھا۔

"ہمّت اور استقلال کے آگے دُنیا میں کوئی چیز مشکل نہیں۔ کوئی کام کیسا ہی مشکل ہو۔ اگر ہمّت اور استقلال سے کام لو گے۔ تو کبھی نہ کبھی ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ ہمّتِ مرداں مدد خدا"

انوپ سنگھ راجہ کس طرح بنا؟

آگرہ کے پاس دھولپور ایک ریاست ہے۔ جہاں مغل بادشاہوں کی ایک عظیم الشان شکارگاہ اور محلات تھے۔ اور جن کے نشان اب بھی دھول پور کی تحصیل باڑی کے علاقہ میں نظر آتے ہیں؛

جہانگیر اس فنگاہ گاہ میں ایک[1] دفعہ چیتے کا شکار کھیل رہا تھا۔ شہزادہ خرم اور کئی امیروں وزیروں کے علاوہ انوپ سنگھ بھی بادشاہ کے ہمراہ تھا۔ یہ انوپ سنگھ قوم کا بڈگجر راجپوت تھا۔ اور ملازمت شاہی میں داخل تھا

انوپ سنگھ ایک درخت پر بہت سے کوے دیکھ کر اس درخت کی طرف گیا۔ دیکھا کہ اس درخت کے نیچے ایک زخمی گائے پڑی ہے۔ سمجھ گیا۔ کہ وہ درندہ جس نے اس کو زخمی کیا ہے۔ یہیں کہیں نزدیک ہی ہوگا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ تو قریب کی جھاڑی میں ایک شیر نظر پڑا۔ جہانگیر کو شیر کے شکار کا بہت شوق تھا۔ انوپ سنگھ نے ایک شخص کو بادشاہ کے پاس خبر دینے کے لئے دوڑایا۔ جہانگیر اپنے فرزند شہزادہ خرم[2] اور دوسرے سرداروں کو لے کر فوراً موقعہ پر آیا۔ سواری کا گھوڑا شیر کو دیکھ کر بھڑکنے لگا۔ بادشاہ نے گھوڑے سے اتر کر بندوق کے دو فائر کئے۔ شیر زخمی ہو کر دہاڑتا ہوا بادشاہ کی طرف جھپٹا۔

[1] یہ واقعہ ۱۲ شوال ۱۰۱۹ھ یعنی آج سے ۳۲۵ سال پیشتر کا ہے۔
[2] یہی شہزادہ بعد میں شاہجہان کے نام سے ہندوستان کا جلیل القدر شہنشاہ ہوا ہے۔

آخر تو وہ شیر ہی تھا۔ سب کے حواس گم ہو گئے۔ امیر اور خدمتگار جو گرد کھڑے تھے۔ گرتے پڑتے اس بدحواسی سے بھاگے۔ کہ اس کشمکش میں بادشاہ بھی زمین پر گر پڑے۔ لیکن صرف انوپ سنگھ ہی ایسا شخص تھا۔ جو حواس قائم رکھ کر اور لٹھ لے کر بادشاہ اور شیر کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ اور دیر تک دونوں آپس میں لڑتے رہے۔ بھاگنے والوں میں سب سے پہلے شہزادہ خرم نے محبت پدری کے جوش میں واپس آکر شیر پر تلوار کا وار کیا۔ پھر راجہ رام داس اور حیات خاں خواص اور کئی لوگ آگئے۔ اور انہوں نے تلواریں پر تلواریں مارنا شروع کیں۔ آخر جب شیر بھاگنے لگا۔ تو انوپ سنگھ نے کمر سے تلوار نکال کر ایسے وار کئے۔ کہ کئی جگہ سے شیر کا بدن کھل گیا۔ اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا +

انوپ سنگھ نے شیر تو مار لیا۔ لیکن خود بھی اس کو کئی زخم آئے۔ بادشاہ کے حکم سے بادشاہی حکیموں نے اُس کا علاج کیا اور تھوڑے دنوں کے بعد جب وہ تندرست ہو کر سلام کو حاضر ہوا۔ تو بادشاہ نے دست خاص سے خلعت کے ساتھ ایک مرصع تلوار عطا کی۔ اور جاگیر عنایت کر کے انوپ سنگھ کو راجہ انوپ سنگھ بنا دیا +

"بچو! تم نے دیکھا۔ وقت پر حواس قائم رکھنے نے ایک معمولی شخص کو کہاں سے کہاں تک پہونچا دیا۔ جب کبھی اسی قسم کا یا ایسا ہی کوئی اور موقعہ تم کو بھی پیش آئے۔ تو دل مضبوط رکھنا چاہئے۔ اور گھبرا کر اور ہمت ہار کر اپنے آپ کو اور دوسروں کو نقصان نہ پہنچانا چاہئے"+

سچّی قومی ہمدردی

قریب قریب تین ہزار برس گذرے ہونگے۔ چین کے دور و دراز ملک میں ایک بچّہ رہتا تھا۔ جو بڑا ہو کر نہایت عالم اور نیک مشہور ہوا۔ اس کی نیکی اور صداقت برسوں سے تاریخ میں زندہ چلی آتی ہے۔ اس چھوٹے نیک بچّے کا نام کنفیوشی اس تھا۔

کنفیوشی اس جب چھ برس کا تھا۔ تو وہ ایک دن اکیلا اپنی کتاب لئے باغ میں بیٹھا تھا۔ اُس نے نشیبی پہاڑی کے ایک طرف مالی کے چھوٹے پیارے بھولے بچّے کو گھاس کی کیاری کے درمیان جہاں اُس کی ماں اُسے چھوڑ گئی تھی۔ بلبلاتے ہوئے دیکھا۔ معصوم کنفیشی کچھ دیر بچّے کی تکلیف کو دیکھتا رہا۔ اور پھر اپنی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ یکایک اس کی نگاہ پھر بچے کی طرف گئی۔ جو آہستہ آہستہ ایک نازک لیکن پوری کوشش سے چینی کے بڑے برتن کی طرف جا رہا تھا۔ جو پھولوں کو پانی دینے کے لئے ہمیشہ وہاں رکھا رہتا تھا۔ معصوم بچّہ ایک لمحے میں اس کے کنارے جا پہونچا۔ اور اپنا چہرہ مُسکرا مُسکرا کر اُس میں دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ کنفیوشی اس حادثہ سے خبردار ہوتا۔ وہ

معصوم بچہ دھڑام سے چینی کے برتن میں گر پڑا۔ کنفیوشی مدد کے لئے چلاتا ہوا دوڑا۔ بچے کا چھوٹا سر ابھی پانی پر نظر آ رہا تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد مالی کے پیارے بچے کا سر پانی میں غائب ہو گیا۔ اور صرف اس کا ننھا بازو اور چمکدار کپڑے پانی کے اوپر نشانِ زندگی بنے ہوئے رہ گئے۔ کنفیوشی چھوٹا کنفیوشی برتن کے چاروں طرف دوڑ رہا تھا۔ اور برتن پر جھک کر بچے کے نکالنے کی بے فائدہ کوشش کر رہا تھا۔ مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر اُس نے ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف مدد کے لئے ہاتھ پھیلائے۔ نیلے آسمان کے خدا سے دُعا کی۔ اور یکایک اُس کے دل میں تدبیر کی ایک روشنی پیدا ہوئی ایسے کہ سورج نے اور نیلے آسمان نے واقعی اُس کی مدد کی ہے۔ کنفیوشی نے بڑے بڑے پتھر کے ٹکڑے جمع کئے۔ اور برتن پر مارنے شروع کئے۔ برتن چینی کا تو تھا ہی۔ فوراً ٹوٹ گیا۔ پانی ایک رو کی صورت میں بہہ نکلا۔ اور بچہ روتا چلاتا زندہ رہ گیا۔

کنفیوشی معصوم اور مصیبت زدہ بچے کو اُس کی ماں کی طرف لئے چلا جا رہا تھا۔ کہ راستے میں اُسے اُس کا باپ ملا۔ جس نے اُس کی تلاش میں باغ کا کونہ کونہ چھان مارا تھا۔ کنفیوشی نے خیال کیا۔ کہ میں نے چینی کا قیمتی برتن توڑا ہے۔ اُس کا باپ یقیناً اُسے مار یگا۔

اُس نے کبھی جھڑکی نہ کھائی تھی۔ اسی لئے تو اُسے شبہ ہو رہا تھا۔

چھوٹا کنفیوشی ہمیشہ سچ بولا کرتا تھا۔ اُس نے آج جو کچھ کیا تھا۔ سچ سچ کہہ دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مالی نے اُسے اپنے بازوؤں میں رحم کی مسرت کے ساتھ دبا لیا۔ اور بہت خوش ہوا۔

بچے کی جان بچانے والا کنفیوشی ایک دن قوم کا سردار بنا۔ اور آج ۲۵ صدی سے برابر اُس کی عزت کی جاتی ہے۔

"قومی ہمدردی انسان کا جوہر ہے۔ اور سچی قومی ہمدردی رکھنے والا دُنیا میں قوم کا سردار بن جاتا ہے۔ اے بچو! تم بھی اس جوہر کو نمایاں کرنے کی کوشش کرو۔ کہ دُنیا میں بہترین چیز یہی ہے۔"

انسان کے لباس میں فرشتہ

تقریباً پچیس سال ہوئے ہونگے۔ کہ میں ایک دُور

[1] یہ واقعہ بابو پرسنھا ناتھ چٹرجی نے جو صوبہ بنگال کے ریٹائرڈ انسپکٹر مدارس ہیں۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کے بنگالی اخبار "پربا سی" میں درج کرایا۔ اور پھر اسی مضمون کا ترجمہ مسٹر سی۔ ایف اینڈریوز نے گاندھی جی کے اخبار ینگ انڈیا میں چھپوایا۔ اور پھر انگریزی سے دہلی کے اردو اخبار الامان نے ۲۷ نومبر ۱۹۲۲ء کی اشاعت میں درج کیا "انسان کے لباس میں فرشتہ" کا جو عنوان ہے وہ بھی پرسنھا ناتھ چٹرجی ہی کا قائم کیا ہوا ہے جنکے ساتھ آج (۱۹۲۵ء) سے ۴۰ سال قبل یہ واقعہ پیش آیا تھا۔

دراز مدرسہ کا معائنہ کرنے کے لئے گیا۔ میرا ارادہ تھا۔ کہ رات ڈاک بنگلہ میں بسر کروں۔ میرے ساتھ سب انسپکٹر بھی موجود تھا۔ وہ شمالی ہندوستان کا راسخ العقیدہ کٹر برہمن تھا۔ رات کے وقت ایسا طوفان آیا۔ کہ ہم اس پر مجبور ہو گئے۔ کہ جو پناہ بھی مل سکتی ہو۔ اس کی جلد از جلد تلاش کریں۔ نہایت مشکل سے ہم ایک گاؤں تک پہونچے۔ اور قریب ترین عمارت میں داخل ہوئے۔ یہ عمارت مویشی باندھنے کے لئے تھی۔ لیکن اس میں صفائی بھی تھی۔ اور زمین بھی خشک تھی۔ اس سخت طوفان میں مالک کی تلاش ناممکن تھی۔ ہمارے گاڑی بان نے کہا۔ کہ یہ مسلمانوں کا گاؤں ہے۔ جس میں ایک بھی ہندو گھر نہیں ہے۔ ہمارے سب انسپکٹر کو بڑی تشویش ہوئی کیونکہ اُسے ایسا کھانا ملنے کی کوئی توقع نہ تھی۔ جو اس کے کٹر عقیدہ کے موافق ہوتا +

تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد گھر کا مالک آیا۔ اس کے چہرہ سے مہربانی ٹپکتی تھی۔ اور اس کی سفید داڑھی دیکھ کر میری ہمت بندھی۔ اس لئے کہ اُس سے پہلے مجھے خوف تھا۔ کہ شاید ہم کو نکال دیا جائیگا۔ لیکن اس شخص کے سفید بال اور خوبصورت مہربان آنکھیں دیکھ کر میرے دل میں خوف کا نام تک نہ رہا۔ اس شخص نے ہم سے کہا۔ مجھے خوف ہے۔ کہ آپ صاحبان کو بہت "تکلیف

ہوئی ہوگی - اب بتائیے - کہ میں کیا خدمت کروں"؟

میرے ساتھی نے عجلت کے ساتھ جواب دیا - (اس قدر عجلت کے ساتھ کہ میں کچھ نہ کہہ سکا) "مولوی صاحب - کچھ تکلیف نہ فرمائیے - ہم ذرا دیر آرام کر کے ڈاک بنگلہ کو جائیں گے"۔

لیکن بوڑھے مسلمان نے جواب دیا - "جناب یہ کیونکر ممکن ہے - آپ میرے مہمان ہیں"۔

سب انسپکٹر نے کہا - بات یہ ہے - کہ ہم راسخ العقیدہ ہندو ہیں - اور آپ کے گاؤں میں ہمیں ایک قطرہ پانی بھی نہیں مل سکتا - کھانے کا تو ذکر ہی کیا ہے"؟

نرم دل مسلمان نے جواب دیا - آپ جو کچھ کہتے ہیں - سچ ہے - لیکن اگر آپ کھانا نہیں کھائیں گے - تو میں اور میری بیوی بھی فاقہ سے رہیں گے - اِس لئے کہ میرے مذہب کا حکم ہے - کہ پہلے مہمان کی تواضع کر دیں - میں صرف ایک درخواست کرتا ہوں - کہ آپ کل تک میرے مکان سے رخصت نہ ہوں"۔

میرا قطعی ارادہ نہ تھا - کہ اس خوفناک موسم میں باہر نکلوں - لہذا میں ٹھیرنے پر راضی ہو گیا - اور اس غریب مگر معزز مسلمان نے ہمیں دو گرم کمبل بھیجے - اور ہم سو گئے۔

اس کے بعد جو ہوا - اس کے متعلق ضروری ہے

کر میں یہ عرض کر دوں ۔ کہ اس زمین میں پانی سطح
سے بہت قریب ہے ۔ رات کو ہم نے ایک شور
سُنا ۔ جس سے میں بہت خوف زدہ ہوا ۔ میں نے
خبر لانے کے لئے چپڑاسی کو باہر بھیجا ۔ واپس آکر
اُس نے کہا ۔ جناب یہ لوگ آپ کے لئے ایک کنواں
کھود رہے ہیں ۔ یہ بوڑھا مسلمان قریب کے ہندو
گاؤں میں گیا ۔ اور ہندو مزدور اپنے ساتھ لے آیا ۔
اس طوفانی رات میں ہمارے لئے پانی مہیا کرنے
کی خاطر بوڑھے مسلمان کا ہندو گاؤں میں جانا مہمان
نوازی اور شرافت کی انتہائی دلیل تھی ۔ میں نے
اپنے دل میں کہا :۔
عزیز بزرگ ! باخدا مسلمان ! تو متبرک ہے !
تو مقدس ہے ۔ میں نے شاستروں میں بہت پڑھا
ہے ۔ کہ خود نارائن (خدا) مہمان کی حیثیت سے لوگوں
کے یہاں گیا ۔ آج مجھے اس کی حقیقت معلوم ہو گئی
اور آج میں نے دیکھا ۔ کہ کیسے فرشتہ خصلت میزبانوں
کے ہاں خدا خود آکر مہمان ہوتا ہے +
اس واقعہ کو پچیس سال گزر چکے ہیں ۔ اب میں
بوڑھا ہو گیا ہوں ۔ لیکن جب میں اس رات کے واقعہ
کا خیال کرتا ہوں ۔ تو میں سفید ریش مسلمان بزرگ
کو تعظیم کے ساتھ سجدہ کرتا ہوں +

جب صبح ہو گئی۔ تو بوڑھا آدمی ہمارے پاس آیا۔ میں نے دیکھا۔ کہ اس کے نورانی چہرہ پر مسرت کی علامات نمایاں ہیں۔ اس نے آکر کہا:۔

"جناب کنواں تیار ہے۔ کسی مسلمان نے اُسے نہیں چھُوا ہے۔ میں اب اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ اس لئے میں نے آگے دوڑ کر اس مسلمان بزرگ کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد میں نے کہا۔ شکریہ۔ نہایت دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب مولوی صاحب! آپ ہمیں کچھ کھانے کو نہ دینگے؟

سب انسپکٹر نے مجھے نہایت عتاب آلود نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن میں نے اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ کمال محبت کے ساتھ میں نے اپنے عزیز بوڑھے مسلمان دوست کو پاس بٹھایا۔ اور ایک مرتبہ پھر کھانا کھانے کی درخواست کی۔ اس نے مجھ سے کہا:۔

"حضور! میں آپ سے یہی درخواست کرنے کے لئے آیا تھا۔ میں کوئی خاص تیاری نہیں کروں گا۔ بلکہ جو کچھ موجود ہے۔ پیش کردوں گا۔ مہربانی کرکے آپ نہا کر اور تکان دور کرکے اپنی صبح کی عبادت کر لیجئے۔ اس کے بعد ہر چیز تیار ملے گی۔ میں ابھی واپس آتا ہوں"۔

سب انسپکٹر نے بوڑھے کے یہ الفاظ سُن کر بیری

طرف غصہ بھری نظر سے دیکھا۔ اور جب وہ مسلمان بزرگ چلا گیا۔ تو میں نے اس سے کہا۔ کہ خدا کیلئے کوئی اعتراض نہ کرنا۔ اس شخص کے ایک بہت بڑے سفر خرچ کا بل چونکہ میری منظوری پر منحصر تھا۔ اس لئے وہ مسکرایا اور کہا۔ "نہیں نہیں آپ بھی ایک اونچی ذات کے برہمن ہیں۔ جب آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنے ملازم کو حکم دیا۔ کہ فرش کو صاف کرنے کے لئے اسے گوبر سے لیپ دے۔ اس شخص کے پاس ایک شیشی میں کچھ گنگا جل تھا۔ اس نے گنگا جل کو اس پر چھڑک دیا۔ اور نہایت زور کے ساتھ کہا۔ کہ "اب مجھے کوئی اعتراض نہیں"۔ اسی اثنا میں وہ مسلمان بزرگ واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں کیلے کے پتے تھے۔ اور ان میں عمدہ پکے ہوئے کیلے رکھے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ اور خشک میوہ بھی اُس نے ہم کو دیا۔ ہم دونوں نے اس بزرگ کے تحفہ سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ اور پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ جب میں چلنے لگا۔ تو میرے دل میں آیا۔ کہ اس بزرگ کے پیروں کے نیچے کی خاک اپنے ساتھ لیتا چلوں۔ کیوں کہ اس کی روح کی طرح اس کے قدموں کی خاک بھی پاک تھی۔ لیکن اس سب انسپکٹر کے سبب سے میں یہ جرأت نہ کر سکا

مگر اس دن سے میں آج تک اس پر افسوس کرتا ہوں۔ کہ میں نے اس قدر اچھا موقعہ ہاتھ سے کیوں کھو دیا۔ اب جب کبھی میں ہندو مسلمانوں کے مابین جھگڑوں کے واقعات سنتا ہوں۔ تو میرا جی چاہتا ہے۔ کہ کسی طرح اس نرم دل بڈھے بزرگ ولی کی روح سے استدلال کر سکوں۔ اور کہوں کہ :-

" اے روح عظیم ! آ اور ہم لوگوں میں سے باہمی نفاق کو اپنے فیاض وجود کے ذریعہ دُور کر دے۔

" جب بعض اوقات جوشیلے مجمعوں کے دیوانہ وار افعال سے روح کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور ملک کی مختلف قوموں میں دنگہ اور فساد تک نوبت پہنچتی ہے۔ تو ایسے ہی فرشتہ خصلت لوگ اپنی روحوں کی پاکیزگی کے ساتھ اعتبار اور محبت کی بندشوں کو مضبوط باندھتے"۔ اور نفرت اور نفاق کی خلیج کو دُور کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

بھیڑیئے کا بچّہ

(شیخ سعدی کی گلستاں سے)

عربی قزّاقوں کی ایک ٹولی نے ایک پہاڑی کی چوٹی پر قبضہ کرکے قافلوں کا راستہ بند کر دیا تھا۔ اُس پاس کے ضلعوں کے باشندے ان کی کارروائیوں سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔ اور سلطان کی فوج بھی شکست کھا چکی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اُنہوں نے پہاڑ کی چوٹی پر ایک ناقابل گذر مقام کو اپنے رہنے اور پناہ لینے کی جگہ بنا رکھا تھا۔ اُس علاقہ کے لوگ اُن کی ایذا رسانی سے ہمیشہ متفکر اور پریشان رہتے تھے۔

آخر ایک فیصلہ کے مطابق ایک شخص کو قزّاقوں کا کام دیکھتے رہنے کے لئے بطور جاسوس مقرر کیا گیا۔ اور ایک جماعت اس تاک میں رہی۔ کہ جب جاسوس اطلاع دے۔ تو فوراً قزّاقوں پر حملہ کر دیا جائے۔ شام کو جس وقت قزّاق لوٹ مار کا مال لے کر واپس آئے۔ تو انہوں نے اپنے ہتھیار اُتار دیئے۔ پہلا دشمن جس نے ان پر حملہ کیا۔ نیند تھی۔ جونہی رات کا پہلا پہر ختم ہوا۔ وہ جماعت جو تاک میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنی

کمینگاہوں سے باہر نکلی۔ اور آتے ہی سب قزاقوں کی مشکیں کس لیں۔ اور ان کے ہاتھ ان کی کمر کی طرف باندھ دیئے۔ صبح ہوتے ہی اُنہیں اپنے بادشاہ کی عدالت میں لے آئے۔ بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ اتفاق سے ان لوگوں میں ایک نوخیز جوان تھا۔ جس کے رخساروں کے باغ کا سبزہ ابھی آغاز ہی ہوا تھا۔ وزیروں میں سے ایک نے بادشاہ کے پایۂ تخت کو بوسہ دیا۔ اور اُس کی جان بخشی کی سفارش کرنے کے لئے اپنی پیشانی زمین پر رکھ کر عرض کی۔ "اس نوجوان نے ابھی باغ زندگی کی لذّت نہیں چکھی ہے۔ نہ عالم شباب کا لُطف اُٹھایا ہے۔ حضور کی فیاضی اور نیک دلی سے مجھے اُمید ہے۔ کہ اگر اس نوجوان کی جان بخشی کی جائے۔ تو خاکسار (وزیر) پر عین نوازش اور احسان مندی ہوگی۔" بادشاہ نے ان الفاظ کو سُن کر تیوڑی چڑھائی۔ کیونکہ یہ بات اس کی اعلیٰ انصاف پسندی کے شایاں نہ تھی۔ اور فرمایا:۔ "جس شخص کی اصلیت میں ہی بدی ہو۔ وہ نیکوں کا سایہ اختیار نہیں کر سکتا۔ کمینہ شخص کے لئے علم ایسا ہے۔ جیسے کہ گنبد پر رکھا ہوا اخروٹ۔ ان کی قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ہی اس وقت سب سے اعلےٰ تجویز ہے۔ جو عمل میں آسکتی ہے کیونکہ آگ کو بجھانا اور چنگاریوں کو چھوڑ دینا۔ یا سانپ کو

مارنا اور اس کے بچے کو بچا رکھنا عقلمندوں کا کام نہیں ہے"۔

وزیر نے کہا۔" بادشاہ سلامت نے جو کچھ فرمایا واقعی صحیح ہے۔ اور بے شک یہ ایک لاجواب دلیل ہے۔ مگر سچ بات یہ ہے۔ کہ اگر اس کی پرورش بدمعاشوں کے ساتھ مل کر ہوتی رہی۔ تو اس پر ان کی خصلت اثر کر جائے گی۔ اور یہ ویسا ہی بدمعاش بن جائے گا۔ مگر غلام کو اُمید ہے۔ کہ اس کو نیک آدمیوں کی صحبت میں تعلیم دی جائیگی۔ اور یہ عقلمندوں کی خصلت اختیار کر لیگا۔ کیونکہ ابھی تو یہ ایک بچہ ہی ہے۔ اور بدکاری کی خصلتیں اور گروہ کی الٹی عادتوں نے ابھی اس کے دل میں مستقل طور پر جگہ نہیں کی ہے۔

اس وزیر نے یہ کہا اور بادشاہ کے مشیروں نے بھی اس نوجوان کی سفارش کرنے میں وزیر کا ساتھ دیا۔ اس لئے بادشاہ نے اس نوجوان کے خون سے درگذر کی۔ اور کہا۔" میں بخشتا ہوں اگرچہ مصلحت نہیں ہے"۔

مختصر یہ کہ اس لڑکے کو ناز و نعمت کے ساتھ پرورش کیا گیا۔ اور اس کی تربیت کے واسطے ایک فاضل اُستاد مقرر کیا گیا۔ اُستاد نے نہایت خوبی کے

ساتھ بات چیت کرنا کسی بات کا جواب دینے کا طریقہ اور بادشاہوں کے پاس بیٹھنے کے تمام ادب و آداب سکھا دیئے۔ اور یہ لڑکا سب کی نظروں میں پسندیدہ ہو گیا۔ ایک روز وزیر نے بادشاہ کے سامنے اس لڑکے کے اخلاق کی خوبیوں کا ذکر کیا۔ بادشاہ نے مسکرا کر کہا:۔ بھیڑیے کا بچہ آخر بھیڑیا ہی ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ انسان کے ساتھ پل کر بڑھ جائے۔

اس کے بعد دو ایک سال گزرے تھے۔ کہ اوباش لوگوں کے ایک گروہ نے اس سے میل جول پیدا کر کے بھائی بندی کا رشتہ جوڑ لیا۔ اور آخرکار ایک مناسب موقعہ پر وزیر کو معہ اُس کے دو بیٹوں کے مار کر بہت سی دولت اپنے ہمراہ لے گیا۔ اور پھر ڈاکوؤں اور قزاقوں میں جا ملا۔ بادشاہ نے یہ سُن کر بالکل سچ کہا:۔

"کہیں خراب لوہے سے بھی اچھی تلوار بن سکتی ہے؟ اے عقلمند کبھی کوئی نا اہل بھی تربیت سے قابل ہوا کرتا ہے"

کمہار کی لڑکی

امریکہ میں ایک غریب شخص کمہار کا پیشہ کیا کرتا

تھا - اس کی ایک چھوٹی سی لڑکی بھی تھی - جو بچپن سے اپنے باپ کے پاس کام کرتے وقت بیٹھنے کی عادی تھی +

جب وہ لڑکی چار برس کی ہوئی - تو اُس کے باپ نے یہ طریقہ اختیار کیا - کہ وہ تھوڑی سی مٹی اُسے دیدیا کرتا - لڑکی مٹی لے کر بڑی خوش ہوتی - اور اُس سے کھیلا کرتی - ہفتے دو ہفتے کے بعد اُس لڑکی میں ایک بات پیدا ہو گئی - کہ وہ اپنے باپ کی ہر حرکت کو بغور دیکھنے لگی - اور باپ کی دی ہوئی مٹی سے طرح طرح کی خوبصورت چیزیں بنانے لگی - جب اور ہوشیار ہوئی - تو بڑی اچھی اچھی اور نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے لگی - باپ یہ دیکھ کر بڑا خوش ہوا - اور اُسے جو کچھ آتا تھا - لڑکی کو سکھا دیا - بیس برس کی عمر میں وہ یہ کام بڑے اچھے اور نادر طریقے سے کرنے لگی - اب تو لوگ اس کی ایجادوں کو حیرت کی نظر سے دیکھتے تھے - وہ دوسروں کی بنائی ہوئی چیزوں کی نقل نہ کرتی تھی - بلکہ اس کے دماغ میں ایجاد کا مادہ تھا - وہ بڑی نزاکت سے نازک نازک پھول اچھی اچھی پتیاں جنگلی پھول اور رنگا رنگ کی چیزیں بناتی تھوڑے دنوں میں اس کی تمام امریکہ میں شہرت ہو گئی +

اس کام کے علاوہ اس نے پانچ برس تک باقاعدہ علم بھی حاصل کیا۔ اور جب وہ پچیس برس کی ہوئی۔ تو اس نے خود اپنا کارخانہ کھول لیا۔ ایک بڑی عظیم الشان کوٹھی کرایہ پر لی۔ اور دور دراز ملکوں سے لوگ اس کے کارخانے سے چیزیں خریدنے کے لئے آنے لگے۔ ہوتے ہوتے وہ اور زیادہ مشہور ہو گئی۔ اور اس نے اپنا ذاتی مکان خرید لیا۔ بیس سال کے بعد اس نے پچاس ایکڑ زمین مول لے کر ایک بڑا کارخانہ کھولا۔ جس میں بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں کام کرنے لگیں۔ اس کارخانے کی مٹی کی عجیب و غریب بنی ہوئی اشیا تمام زمانے میں مشہور ہیں۔ اس کارخانے میں جتنے کاریگر کام کرتے ہیں۔ ان سب کے رہنے کے لئے کارخانے کے قریب ہی مکان بنے ہوئے ہیں۔ امریکہ میں یہ کارخانہ بہت ہی مشہور ہے۔ اور اس کے بانی کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ اب اس کی شادی ہو گئی ہے۔ اور وہ بڑی امیر ہے۔ اور دراصل یہ وہ دولت ہے۔ جو اس نے اپنی محنت سے پیدا کی۔ وہ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں پر بڑی مہربانی کرتی ہے۔ اور نام تو اس کا تمام امریکہ میں مشہور ہو ہی چکا ہے۔

"کامل غور کا نتیجہ ہمیشہ مفید ثابت ہوتا ہے"

امریکن لڑکی کی طرح ترقی کرنے کی کوشش کرو۔ لگاتار کوشش کر زندگی کا راز ہی یہی ہے +

بادشاہ اور سپاہی

دہلی کے بازار میں ایک دن ایک راجپوت سپاہی جو ملک کے اُس حصے کے باشندوں میں سے ایک تھا جسے بابر نے حال ہی میں فتح کیا تھا۔ اپنے بھائیوں کی تباہی اور بربادی سے اثر پذیر ہو کر شہنشاہ بابر کے قتل کرنے کے ارادے سے ٹہل رہا تھا۔ کہ یکایک اُس نے بازار کے آدمیوں کو تیزی سے اِدھر اُدھر دوڑتے دیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ طلسم کھلا۔ اور معلوم ہوا۔ کہ ایک بدمست ہاتھی اپنی زنجیروں کو توڑ کر بھاگ نکلا ہے۔ راجپوت سپاہی آدمیوں کے جمع میں بادشاہ کو تلاش کرتا پھرتا تھا۔ چونکہ اس نے سُنا تھا۔ کہ بادشاہ اپنی رعایا کی حالت دیکھنے کے لئے اکثر عوام کے لباس میں سڑکوں پر ٹہلا کرتا ہے اس اثنا میں ہاتھی بہت ہی قریب آ گیا۔ اور بھاگڑ زیادہ مچ گئی۔ اسی بھاگ دوڑ میں ایک عورت کی بغل سے اس کا ننھا بچہ نکل کر گر پڑا۔ اور اُس کی

جان بچنے کی کوئی اُمید نظر نہ آئی۔ چونکہ ہاتھی قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اور کچھ دیر میں بچہ ہاتھی کے عظیم پاؤں سے سرمہ ہونے کو تھا۔ کوئی خدا کا بندہ اس معصوم کی مدد کو نہ جانا چاہتا تھا۔ وہ بچہ ایک رذیل ترین فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہاتھی قریب آتا جاتا تھا اور اُس معصوم بچے کی جان جانے میں یقین کا اضافہ بھی ہوتا جاتا تھا۔ کہ یکایک آدمیوں کے مجمع سے بھیڑ کو چیرتا ہوا ایک دراز قامت خوبرو انسان بچے کی طرف جھپٹا۔ اور جھپٹ کر بچےؔ کو اٹھا لیا۔ اور ہاتھی کی سُونڈ سے بچ کر ایک جست کے ساتھ صاف نکل گیا۔ تھوڑی دُور جاکر اُس نے بچےؔ کو جب اپنی آغوش سے جدا کیا۔ تو جھکتے ہُوئے اس کی پگڑی زمین پر گر پڑی۔ جسے راجپوت سپاہی نے دیکھ لیا۔ اور شاہی طرّہ سے بابر کو پہچان لیا۔ راجپوت سپاہی بابر کی رحمدلی، بہادری نیک طبعی سے بڑا مسحور ہوا اور آگے بڑھ کر قدموں پر گر پڑا۔ معافی مانگی۔ اور برہنہ خنجر بابر کو دے کر اپنے قتل کا خواہاں ہوا۔ اور کہنے لگا۔ کہ آج مجھے معلوم ہوا۔ کہ ہر انسان کی جان کی حفاظت کرنی اس کی جان لینے سے بہتر ہے۔ بابر نے راجپوت سپاہی کو مُسکراتے ہوئے اُٹھایا۔ اور گلے سے لگا لیا۔ بابر اس سپاہی کے راجپوتانہ انداز

سے بیحد خوش ہوا۔ اور اسی وقت اپنے باڈی گارڈ (محافظِ جان) کا عہدہ اس سپاہی کو عطا کیا۔ راجپوت سپاہی شاہی ملازمین میں داخل کر لیا گیا۔ جس نے بابر کی بڑی خدمت کی۔ اور کئی معرکوں میں بابر کی جان بچائی۔

"کسی کی جان لینے سے بہتر اُس کی جان کی حفاظت کرنا ہے۔ رحمدلی دنیا میں ہر ایک کو ہر دلعزیز بنا دیتی ہے۔ اور بہادری تاریخ کے صفحوں پر انسان کو جگہ دیتی ہے۔

ظرافت نے جان بچالی

بالاکریف روس کے مشہور ظریف نے ایک دن شہنشاہ روس سے عرض کیا۔ کہ مجھے شاہی محل کی محافظت پر متعین کر دیا جائے۔ شہنشاہ نے کہا۔ تو مسخرہ کیا حفاظت کریگا۔ مسخرے آدمی فوجی کام کیا کر سکتے ہیں۔ بالاکریف نے بادشاہ کی بڑی منت سماجت کی۔ اور کہا۔ مجھے تو فوجی کام اور سپاہیانہ حیثیت سے بڑی محبت ہے۔ آپ ضرور مجھے محافظ مقرر کر دیں۔ شہنشاہ بھی بالاکریف کے ساتھ تمسخر کیا کرتا تھا۔ اور اکثر بادشاہ اپنی دلچسپی کے لئے ایسا کیا ہی کرتے

ہیں۔ چنانچہ بادشاہ نے کہا۔ اچھا ہم تیری آرزو پوری
کرتے ہیں۔ لیکن اگر تو پہرہ پر سو گیا۔ یا تلوار وغیرہ
گم کر دی۔ تو صبح ہی تجھے پھانسی دیدی جائیگی۔ یہ کہکر
بادشاہ نے حکم دیدیا۔ کہ آج بالاکریف کو شاہی محل
کے دروازہ پر محافظ کی حیثیت سے متعین کیا جائے
بادشاہ نے اُس کے پاس ایک آدمی کو کچھ نشے کی
چیز دے کر روانہ کیا۔ بالاکریف کئی گھنٹے سے پہرہ
پر تھا۔ اس لئے اُسے پیاس معلوم ہو رہی تھی۔ اُس
نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اُس آدمی کی خوشامد شروع کردی
اور اُسے پھسلانا شروع کیا۔ وہ آدمی جسے بادشاہ نے
بھیجا تھا آیا ہی اسی لئے تھا۔ کہ بالاکریف کو چت کرے
چنانچہ بالاکریف کو اُس نے وہ نشہ آور چیز خوب پیٹ
بھر کر پلائی۔ تھوڑی دیر کے بعد بالاکریف بیہوش ہو
گیا۔ اور چوکی پہرہ حفاظت محافظت سب بھول گیا
بادشاہ نے چپکے سے اُس کی کمر سے تلوار نکال لی+
جب صبح کو بالاکریف کی آنکھ کھلی اور بغل میں
تلوار کو نہ پایا۔ تو حواس باختہ ہو گیا۔ اور کانپنے لگا۔
کیونکہ اُسے کامل یقین تھا۔ کہ اب اُسے ضرور پھانسی دے
دی جائے گی+
بالاکریف کے پاس ایک لکڑی کی تلوار بھی تھی جس
سے وہ مسخراپن کیا کرتا تھا۔ اور جس کا نیام بالکل اصلی

تلوار کی مانند تھا۔ اُسے اور تو کوئی تدبیر سوجھی نہیں۔ یہی لکڑی کی تلوار لگا کر پریڈ پر آ پہنچا اور قواعد کرنے لگا۔ بالاکریف کو یقین تھا۔ کہ بادشاہ کو اس کی اس چالاکی کی خبر نہ ہوگی۔ اور یہ نہ جانتا تھا۔ کہ یہ سب کچھ بادشاہ ہی کے اشاروں پر ہوا ہے +

بادشاہ نے اس کے چہرہ سے اس کی چالاکی تاڑ لی۔ اور ایک سپاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے بالاکریف سے کہا۔ "یہ کیسی بدتمیزانہ وضع سے کھڑا ہے۔ یہ شخص تو واجب القتل ہے۔ کپتان بالاکریف! اس وقت تم اپنی تلوار نکال کر اس کمبخت کی گردن اڑا دو +

بالاکریف یہ سُن کر بہت ڈرا۔ اس کا خون خشک ہو گیا۔ اور اُسے یقین ہو گیا۔ کہ اب وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ سمجھ گیا۔ کہ اب اس کی قلعی ضرور کھل جائے گی۔ مگر تعمیل ارشاد کے طریقہ پر اسی وقت ہاتھ رکھ کر بولا۔ " اے خدا! میں نے آج تک کسی کا خون نہیں کیا ہے۔ میں تیرے قہر سے لرز رہا ہوں اور ایک انسان کی گردن اڑانے کی اہلیت اپنے میں قطعی نہیں پاتا۔ تجھے اپنی قدرت کی قسم میری چمکدار تلوار کو لکڑی کا بنا دے" ان الفاظ کو ختم کرنے ہی بالاکریف نے تلوار نیام سے نکالی۔ تو وہ واقعی لکڑی

کی تھی +

پیٹر اعظم جس کا چہرہ غصّہ سے تمتما اٹھا تھا۔ اور جو اب بھی ہنسی کو روک کر اپنے غیظ کا اظہار کر رہا تھا۔ ایک طرف سنجیدگی سے کھڑا تھا۔ دوسری طرف تمام فوج ہنسی کی وجہ سے دوہری ہوئی جاتی تھی۔ ہر شخص بالاکریف کی اس ظرافت پر ہنس رہا تھا اور ضبط کے باوجود کوئی قہقہہ نہ روک سکتا تھا۔ شہنشاہ سے بھی آخر ضبط نہ ہوا۔ اور وہ بھی چلا کر اور قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اور اس طرح غریب بالاکریف کی جان بچ گئی +

"ظرافت زندہ دلی کا دوسرا نام ہے ہنسی ہاضمے کے لئے بیحد مفید چیز ہے۔ اور خندہ دن بھر کی تکان کے بعد دماغ کو ہلکا کرنے کے لئے ضروری شے ہے۔ جب کتاب دیکھ کر بیٹھو۔ تو سنجیدہ ظرافت سے ضرور اپنے دل کو مسرور کرو۔ اور ایک وقت خوب ہنسو"۔

کشمیر کا ایک رعایا پرور راجہ

حضرت مسیح سے قریباً سوا سو سال پیشتر کشمیر میں ایک راجہ تونجین کے نام سے گذرا ہے۔ وہ بڑا

منصف حکمران تھا - اس کی رانی کا نام واگ پشٹا تھا - وہ بھی بڑی خوبیاں رکھتی تھی +

ایسے نیک دل راجہ اور ایسی رحم دل رانی کے عہد میں بھی کشمیر کو قحط کی سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑا - اس قحط کی دلچسپ اور دل پہ اثر کرنے والی حکایت راج ترنگنی کے انگریزی ترجمہ میں تفصیل سے درج ہے اس کا ذکر اب اُردو میں کیا جاتا ہے +

ان پاک نفس راجہ اور رانی کے امتحان کے لئے آسمان سے ایک بڑی ہولناک مصیبت قحط کی نازل ہوئی +

بھادوں کے مہینہ میں جب چاولوں کی فصل تیار ہوتی ہے - کشمیر میں اتنی بھاری برف پڑی - کہ زمین اور آسمان درخت اور میدان اور پہاڑ اور وادیاں اور مکین اور مکان سب سفید نظر آنے لگے +

اس برف کے گرنے سے لوگوں کو اپنے زندہ رہنے کی اُمید نہ رہی - کیونکہ چاول ہی اس ملک کی خوراک ہیں - اور چاولوں کی فصل ہی کا ستیاناس ہو گیا +

قحط نے ایسی قیامت برپا کی - کہ ایک ایسا ملک جو بہشت کا نمونہ تھا - دوزخ بن گیا - تھوڑے ہی دنوں میں ملک ایسے کنگلوں سے بھر گیا - جن کے پوست و استخوان کے درمیان گوشت نام کو نہ تھا +

بھوک کی تکلیفوں کے مارے بھوکوں نے خوراک حاصل کرنے میں اپنے ننگ و ناموس اور شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیا +

باپ بیٹوں میں یہ حال تھا۔ کہ ہر ایک اپنا ہی پیٹ پہلے بھرنا چاہتا تھا۔ دوسرے کے چیخنے چلانے کا کسی پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا +

زندہ آدمی مُردوں کی صورت میں نظر آتے تھے جو خوراک کے لئے آپس میں لڑتے رہتے تھے +

ہر شخص فاقوں کے مارے ایسا ضعیف و ناتوان ہو گیا تھا۔ کہ اس کی صورت مسخ ہو گئی تھی۔ آواز ڈراؤنی نکلتی تھی۔ جو چیز اُس کے آگے آتی تھی۔ وہ پاک ہو یا ناپاک وہ اُسے کھانا شروع کر دیتا تھا +

پرجا کی یہ دردناک حالت دیکھ کر راجہ کو رحم آیا +

وہ اپنی سواری کے جلوس کو چھوڑ کر تن تنہا کنگلوں کے پاس جاکر اُن کے دُکھ کو دور کرتا۔ اور جہاں تک ہو سکتا۔ اُن کی مدد کرتا +

اُس نے اپنے خزانوں سے اور منتریوں (وزراء) کی جمع پونجی سے خوراک خرید کر بھوکوں کو کھلائی۔ راجہ کی طرح رانی نے بھی بھوکوں کی امداد کے لئے اپنے خزانے کھول دیئے +

ہر ایک آدمی کی خبر لی جاتی تھی۔ خواہ وہ جنگل

میں ہو یا مرگھٹ میں یا گلی کوچہ میں یا اپنے گھر میں۔
جب راجہ کی ساری دولت اور پونجی خرچ ہو چکی۔ اور غلہ ختم ہونے سے ملک میں کہیں خوراک باقی نہ رہی۔ تو راجہ دل آزردہ اور غمزدہ ہو کر رات کو اپنی رانی سے کہنے لگا۔

اے رانی! میرا پختہ یقین ہے۔ کہ ہمارے گناہوں کی شامت سے یہ ہولناک آفت ہماری بے گناہ رعایا پر نازل ہوئی ÷

میری رعایا جو ترس اور رحم کی مستحق ہے۔ وہ آفت اور بلا میں مبتلا ہو۔ اور کوئی اُس کا بچانے والا نہ ہو۔ اس حالت میں میری زندگی پر افسوس ہے۔

میں اپنی اس شاندار زندگی کو کیا کروں۔ جب میں اپنی رعایا کو اس خوف و خطر سے نہیں نکال سکتا۔ میری رعایا تباہ ہے۔ میرا ملک تباہ ہے۔ لوگوں سے پریم اور پیار رخصت ہو چکا ہے۔ رعایا کی یہ سراسیمگی اور ملک کی یہ ویرانی اب مجھ سے دیکھی نہیں جاتی ÷

میں نے ان دنوں میں اپنی رعایا کو کسی نہ کسی طرح کھلایا۔ اور کسی کا دم بھوک کے مارے نکلنے نہیں دیا۔

لیکن دن ایسے بُرے آئے ہیں۔ کہ دھرتی نے اپنی بھلائی کو چھوڑ دیا۔ اس کی بزرگی رخصت ہوئی۔ وہ ایسی مفلس ہوئی۔ کہ کسی کو کھلا نہیں سکتی ÷

اب رعایا کے بچانے کے کون سے وسائل باقی ہیں ؟ وہ بلا کے متلاطم سمندر میں ڈوبی جاتی ہے۔
سورج کو مہیب دن نے تاریک کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ دنیا کی روشنی کوئی چُرا کے لے گیا۔ اب دن کو بھی اور رات کو بھی سوائے اندھیرے اور اندھیر کے مجھے کچھ نظر نہیں آتا ؛

مُلک سے پار جو شاہ راہیں جاتی ہیں۔ اُن کو برف کے پہاڑوں نے ایسا مسدود کر دیا ہے۔ کہ کوئی اُن سے گذر نہیں سکتا۔ آدمی ایسے بے بس و بیکس ہو رہے ہیں۔ جیسے کہ پرند جو اپنے گھونسلوں میں بند ہوں۔ بڑے بڑے سوربیر۔ بدھ مان۔ پنڈت سب کے سب مصیبت کے ہاتھ سے بیقرار و بے بس ہو رہے ہیں ؛

مجھے نجات کا کوئی ذریعہ دکھائی نہیں دیتا۔ اپنی رعیّت کی ہلاکت کا خوفناک منظر دیکھنے سے بہتر یہی ہے۔ کہ میں اپنے آپ کو آگ میں جلا کر خاک سیاہ کر دوں ؛

رعایا کے وہ فرماں روا بڑے خوش نصیب ہیں۔ جو اپنی رعایا کو اولاد سمجھتے ہیں۔ اور اُن کا سُکھ دیکھتے ہیں۔ اور رات کو آرام سے اپنی نیند سوتے ہیں ؛
راجہ یہ کہکر رنج و غم کے ساتھ پلنگ پر لیٹ

آگیا۔ اُس نے اپنا مُنہ ڈھک لیا۔ اور دردانگیز سبکیاں لینے لگا۔

راجہ کی یہ بات سُن کر رانی نے جس پر ہمیشہ آگاہی کے چراغ روشن رہتے تھے۔ یہ جواب دیا۔

اے راجہ تو کس مغالطے اور دھوکے میں پڑا ہے اگر تو اپنے آپ کو ہلاک کر دیگا۔ تو کیا تیری رعایا تباہی سے بچ جائے گی۔ معمولی آدمی بھی مصیبت میں نہیں گھبرایا کرتے۔ اے راجہ تو تو بڑے دل گردہ والا راجہ ہے۔

اگر کسی آدمی میں ایسی قدرت نہ ہو کہ وہ بڑی بڑی آفتوں کو مغلوب کر سکے۔ تو اے راجہ مجھے بتا کہ بزرگی اور بڑائی میں وہ شخص کیسے ممتاز ہو سکتا ہے۔

جو راجہ اپنے قول و اقرار کا اور عہد و پیمان کا سچا ہے۔ جو اپنی رعیت کی خوشحالی کو اپنی خوشحالی سمجھتا ہے۔ اُس کی حکم عدولی تو اندر اور برہما اور موت کا فرشتہ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ سب اس کے حکم کے تابع ہوتے ہیں۔

عورتوں کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ اپنے شوہروں کی اطاعت کریں۔ وزیروں کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ وفاداری اور خیر خواہی کریں۔ راجاؤں کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ اپنی رعایا کی بہبودی کے لئے اپنے دل و جان اور اپنی دھن

دولت کو بالکل وقف کر دیں +

اے راجہ کہ تو سب راجاؤں سے زیادہ پاک دل ہے۔ اُٹھ تیری رعایا کو بھوکے مرنے کا خوف نہیں ہے۔ خوف ہے۔ تو یہ کہ تو ان کے غم میں جان نہ دیدے +

ہاں اے راجہ! اُٹھ تاکہ ہم دونوں اپنے دیوتاؤں کے حضور میں گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ ہماری عاجزی ضرور ان کو پسند آئے گی۔ وہ ہماری دعاؤں کو سُنیں گے۔ اور ہماری اور ہماری غریب رعایا کی مصیبتیں دُور ہو جائیں گی۔ اس طرح ہمت ہار کر خود کشی کر لینا تو راجاؤں کا کام نہیں ہے +

راجا اور رانی رات بھر رو رو کر دعائیں مانگتے رہے۔ ان کی دعائیں سچّے دل سے تھیں۔ اور اپنی رعایا کی بہتری اور بھلائی اور مُلک کی آبادی کے لئے تھیں۔ انہوں نے اپنے دیوتاؤں سے اپنے کردہ و ناکردہ گناہوں کی معافیاں مانگیں۔ آخر اُن کی دعائیں قبول ہوئیں۔ اور صبح ہوتے ہی لاکھوں کبوتروں کے جُھنڈ نہ معلوم کہاں سے اس مُلک میں آنے لگے۔ جس سے بھوکوں اور کنگلوں کا پیٹ بھرنے لگا۔ رانی نے سوا اس کے کہ رعایا کبوتروں سے اپنا پیٹ بھرے۔ اپنے رہے سہے ذخیئے بھی ختم کر دیئے +

راجہ اور رانی کی تپسیا اور ریاضت سے تھوڑے ہی دنوں کے بعد آسمان بھی صاف ہو گیا۔ ملک سے قحط بھی جاتا رہا۔ نئی فصل بھی تیار ہو گئی۔ اور اس ملک میں جس کے گلی کوچوں میں لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں۔ اور جس کے "زندہ" مُردوں سے بدتر تھے۔ پھر زندگی کے آثار نظر آنے لگے +

"مغرب کے لوگ آسمانی بلاؤں خصوصاً قحط کو جو بارش نہ ہونے یا بارش زیادہ ہو جانے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ انسان کے گناہوں کا باعث نہیں سمجھتے۔ لیکن مشرق کے لوگوں کا اعتقاد ہے۔ کہ آسمانی آفتوں اور مصیبتوں کے نازل ہونے کا باعث ہماری شامتِ اعمال بھی ہے۔ اور اس کا علاج ایک دوسرے سے ہمدردی کے اظہار۔ خدا کی عبادت۔ گناہوں کی معافی۔ اور ریاضت جسمانی کے ذریعہ بھی ہو سکتا ہے +

میووں کا تیوہار

کئی صدیاں گذریں۔ ایک بار جرمنی کے شہر ہمبرگ کا محاصرہ اس کے کسی دشمن نے کر لیا۔ اور

اتنے عرصے تک اُسے جاری رکھا۔ کہ شہر میں جو لوگ بند تھے۔ گھرے ہوئے تھے۔ اُن کے پاس کھانے کو بھی نہ رہا۔ آخر ہمبرگ کے باشندے گہری سوچ میں مبتلا ہو گئے۔ کہ اب انہیں اطاعت قبول کر لینی چاہیئے۔ یا شہر کے دروازے کھول دینے چاہئیں ؛

ولف ہمبرگ کا ایک مشہور سوداگر ایک صبح غمگین صورت بنائے اپنے مکان کی طرف چلا جا رہا تھا۔ یکایک اس کے دل میں خیال آیا۔ کہ وہ اپنے باغ کی سیر ہی کرے۔ جب وہ اپنے خوبصورت دلفریب اور اپنے مناظر والے باغ میں پونچا۔ تو اُس کے دل سے غم کا بہت سا بوجھ اُتر گیا۔ اور وہ کچھ مسرور سا ہو گیا۔ اسی دھندلے سے سرُور میں اُس نے ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھولا۔ اور اندر جا کر دیکھا۔ تو اُس کی مسرتوں کی کوئی حد نہ رہی۔ ولف نے اپنی کوٹھڑی کو تازہ معطر انگوروں اور لذید خوش ذائقہ میوؤں سے بھرا ہوا پایا۔ جس کا مل جانا یا نظر آ جانا اس حالت میں کہ شہر دشمن کے پنجہ میں تھا۔ اور رسد ختم ہو چکی تھی۔ غیر مترقبہ نعمت سے کسی طرح کم نہ تھا۔ لیکن اُس نے اپنی مسرت سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ یعنی اُس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا جو علاوہ خوراک پانی کے ہمبرگ اور اہل شہر کی رہائی کا بھی سبب ہوا۔ تدبیر کے ساتھ جب تقدیر سیدھی

ہوتی ہے - تو ایسی ہی باتیں رد پذیر ہوتی ہیں - ولف نے ذرا تامل نہ کیا اور ذرا تاخیر نہ کی - اور اپنے اس خیال کو عملی صورت میں لانے کے لئے تین سو معصوم بچوں کو سفید لباس پہنا کر صلح اور امن کے فرشتوں کا ایک وفد بنایا - اور اُن کے کندھوں پر لذیذ اور خوبصورت میووں کی تھیلیاں رکھ کر شہر کے دروازے کھول دیئے - اور انہیں دشمن کے خیموں کی طرف روانہ کر دیا +

دشمن سپہ سالار نے جب اتنے چھوٹے قد کے سپاہی اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھے - تو وہ ٹھٹکا اور کچھ سوچنے لگا - لیکن جب اُسے اپنی قوتوں کا احساس ہوا - تو اُس نے کہا - کچھ پرواہ نہیں - وہ میرے ساتھ کوئی چال نہیں چل سکتے - اور اگر چاہینگے تو انہیں پیس دیا جائے گا +

وہ یہ کہہ ہی رہا تھا - کہ سفید پوش معصوم بچے فردوسی فرشتوں کی طرح اس کے نزدیک پونچ گئے اور اُس کی خدمت میں اُنہوں نے خوشبودار لذیذ میوے تحفے کی طرح پیش کئے +

سپہ سالار پر بچوں کے اس طرز عمل کا بے حد اثر پڑا اور اُس نے اہل ہمبرگ سے ہمدردی اور رحم کرنے کا خیال اپنے دل میں مستحکم کر لیا - اس نے محاصرہ

اٹھا لیا۔ اور ہمبرگ کو آزاد کر دیا۔ اہل شہر کو کسی قسم کی تکلیف نہ دی +

اس زمانے سے ہر سال بہادر معصوم بچوں کی یادگار میں ایک بڑا عظیم الشان تیوہار ہمبرگ میں بڑی دھوم دھام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ جس کا نام "میووں کا تیوہار" ہے +

"کیا یہ اُن بچوں کی بہترین یادگار نہیں ہے یقیناً" اُنہوں نے بڑے ہو کر بڑے بڑے کام کئے ہونگے۔ لیکن سب سے بڑا کام اپنی قوم کے لئے معصوموں نے یہی کیا۔ جو بنی نوع انسان سے ہمدردی کریگا۔ اس کے مرنے کے بعد اسی طرح اس کی یادگاریں قائم ہوں گی +

سکندرِ اعظم اور ایک وحشی سردار

سکندرِ اعظم جب دنیا کا سفر کرتے کرتے افریقہ کے ایک جنگلی شہر میں جا نکلا۔ تو اُس نے دیکھا۔ کہ وہاں ایک سیدھی امن پرور قوم آباد ہے۔ وہ قوم گھاس کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں میں رہتی ہے۔ اور وہ لڑنے بھڑنے سے قطعی ناواقف ہے۔ اسے

کچھ نہیں معلوم کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کون بادشاہ کون سے بادشاہ کو ستا رہا ہے۔ اور کس کی فوج کس کی رعایا کے کھیتوں کو برباد کر رہی ہے۔ اس قوم کی فطرت ہی کچھ لاپرواہ واقع ہوئی تھی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وہ عمداً ان حادثات کو معلوم نہیں کرنا چاہتی تھی

جب اُس جنگل میں سکندر وارد ہوا۔ تو اس قوم کے لوگ اُسے اپنے بادشاہ یا سردار کے پاس لے گئے۔ جو سکندر کو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا۔ اور سکندر کی بڑی خاطر کی۔ اور جب سکندر اعظم کھانا کھانے کے لئے بیٹھا۔ تو اس کے سامنے چاندی کی روٹیاں رکھی گئیں۔ اور نہایت انکسار سے سردار نے کہا۔ کہ حضورِ اعلےٰ! اگرچہ یہ ذلیل و حقیر کھانا آپ کی شان کے مطابق نہیں ہے۔ تاہم غریبوں کے حال پر رحم کرتے ہوئے اسے قبول فرمائیے۔ سکندر کو بڑا تعجب ہوا۔ اور اُس نے سردار سے دریافت کیا کیا آپ کے ملک میں ایسی ہی روٹیاں کھائی جاتی ہیں۔ سردار نے ہنس کر جواب دیا۔ نہیں ہم لوگ ایسی روٹیاں تو نہیں کھاتے۔ لیکن کھانا لاتے وقت یہ سوچا گیا۔ کہ گندم کی روٹیاں جیسی ہم کھاتے ہیں آپ بھی مقدونیہ میں کھاتے ہونگے +

اور اگر یہی روٹیاں کھا کر آپ مقدونیہ کو پسند کر کے اُس پر اکتفا کرتے۔ تو دور و دراز سے سفر کرنے کی تکلیف کیوں اُٹھاتے +

سکندر نے سُنا اور دل ہی دل میں شرمایا۔ اور اُس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ بڑی دیر کے بعد اُس نے کہا۔ مجھے دنیا کی سیر کا نہایت شوق ہے۔ اور میں چلنے پھرنے سے بڑا ذوق رکھتا ہوں۔ اور میری ایک خواہش یہ بھی ہے۔ کہ میں مختلف قوموں کے رسم و رواج کو بھی معلوم کرتا رہوں۔ میں آپ کی خوش اخلاقی سے بڑا مسرور ہوں۔ اور آپ لوگوں نے میری بڑی خاطر تواضع کی ہے +

امن پسند قوم کے سردار نے ہنس کر کہا۔ یہ تو سب ٹھیک ہے۔ لیکن یہ تو آپ کا ہی گھر ہے۔ آپ اگر چاہیں۔ تو ساری عمر یہیں بسر کر دیں۔ سکندر اعظم نے سردار کی ان باتوں سے اپنے حالات پر بڑا غور کیا۔ اور جب اُس نے اپنے ملک فتح کرنے کے شوق کو سردار کی نگاہوں سے دیکھا۔ تو اُسے بڑی شرم آئی۔ اور جب اُسے یہ خیال ہوا کہ میں ان نیک لوگوں کا مُلک لینے کے لئے آیا تھا۔ تو اور بھی پانی پانی ہو گیا +

آخر کار سکندر اعظم نے سردار سے معافی چاہی۔

اور اُسے بڑی تسلی دی - اور اپنے ملک کو واپس چلا آیا +

"کبھی کسی کمزور پر زبردست کو ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیئے - ہوس دنیا میں ذلیل ترین چیز ہے. ہر ایک کو اس سے بچنا چاہیئے +

بُخل کا انجام

سعد بن مروان عرب میں ایک مشہور بخیل گذرا ہے - ایک دن کا ذکر ہے - کہ اس کے مکان پر چند شاعر اور فاضل پونچے - سعد کا بخل تو مشہور ہی تھا - کمبخت نے صبح سے چار بجے شام تک نہ خود کھانا کھایا اور نہ مہمانوں کو کچھ کھانے کو دیا +

لیکن جب مہمانوں کو بہت زیادہ بھوک لگی - تو اُنہوں نے شور مچایا - سعد کو یہ بڑا ناگوار ہوا - اس نے غلام کو آواز دی - اور کہا - کہ کچھ ہو - تو کھانے کے لئے لے آ - غلام آیا - اور تھوڑی دیر کے بعد ایک نہایت سڑیل اور بڑا دسترخوان بچھا کر چلتا بنا - اور کمبخت مغرب سے کچھ پہلے واپس آیا - ایک سوکھی روٹی اور ایک پیالے میں یونہی کچھ شوربا سا جو حقیقت میں گرم پانی تھا رکھ کر کھڑا ہو گیا - اُس شوربہ میں

مُرغ کے پَر سے پڑے تھے ۔ سعد نے پیالے کو بغور دیکھ کر کہا ۔ کہ تو شوربا تو اُتار لایا ۔ مُرغ کا سر کہاں ہے ؟ غلام نے کہا ۔ سر کھانے کے قابل نہیں ہوتا سعد نے کہا ۔ دیوانے ! میں تو مُرغ کے پنجوں تک کو قیمتی سمجھتا ہوں ۔ اور عزیز رکھتا ہوں ۔ تو کہتا ہے ۔ کہ سر کھانے کے قابل نہیں ہوتا ۔ حالانکہ مُرغ کے سر کے متعلق بڑی فضیلتیں بیان کی جاتی ہیں ۔ مُرغ اپنے سر سے اذان دیتا ہے ۔ اس کا تاج بادشاہوں کے تاج کی طرح ہے ۔ اور مُرغ اُن آنکھوں سے جو اُس کے سر میں ہوتی ہیں ۔ فرشتوں کو دیکھتا ہے ۔ اور سب سے قیمتی بات یہ ہے ۔ کہ اُس کے سر کا مغز گُردے کے درد میں کام آتا ہے ۔ ظالم غلام تُو نے اُس کا سر کیوں پھینک دیا ۔ میں نہ کھاتا ۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچّے کھاتے ۔ وہ بھی نہ کھاتے ۔ تو میرے بھوکے مہمان کھا لیتے ۔ جا چلا جا ۔ اور وہ سر اٹھا کر لا ۔ کیا تو نے میرے مال کو ڈاکوؤں کا مال خیال کر لیا ہے ۔ غلام نے کہا ۔ مُرغ کو ذبح کئے ایک ہفتہ سے زیادہ ہو چکا مجھے یاد نہیں رہا ۔ کہ میں نے اُسے کہاں ذبح کیا تھا ۔ اور اُس کا سر کہاں پھینکا تھا +

مہمانوں کو یہ سُن کر بڑا تعجب ہوا ۔ لیکن وہ خاموش بیٹھے رہے ۔ اور سعد کے بخل کا تماشہ دیکھنے لگے +

سعد نے غلام کے الفاظ سُن کر کہا۔ مجھے معلوم ہے بد معاش۔ کہ تُو نے مُرغ کا سر کہاں پھینکا ہے خدا کی قسم! تُو نے اُسے اپنے پیٹ میں پھینکا ہے۔ غلام نے کانپتے ہوئے کہا۔ آپ کو جھوٹی قسم کھاتے ہوئے خدا اور اُس کی عظمت یاد نہیں آتی +

یہ سُننا تھا۔ کہ قیامت آ گئی۔ وہ غصّہ سے سُرخ ہوگیا۔ اُس نے غلام کو خُون بھری آنکھوں سے دیکھا۔ اور اُس سے ہاتھا پائی کرنے لگا۔ غلام بھی اس کے سامنے خم ٹھونک کر آ ڈٹا۔ اور دھڑلے کی لڑائی ہونے لگی۔ اور اس لڑائی جھگڑے میں شوربے کا پیالہ اُلٹ گیا +

مہمانوں نے یہ دیکھا۔ تو وہ آقا اور غلام کو لڑتے جھگڑتے چھوڑ کر رفو چکر ہو گئے +

"بُخل نہایت بُری چیز ہے۔ یہ لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کر دیتا ہے۔ بخیل کی حقیقی عزّت کبھی کوئی نہیں کرتا۔ بُخل سے ہمیشہ بچو۔ کہ بخیل کبھی دنیا میں سرسبز نہیں ہوتا +

ایک دہقانی کی حاضر جوابی

عباس ایران کا بادشاہ ایک روز پہاڑوں کے درمیان

ایک گھاٹی میں سورج نکلنے سے پہلے شکار کھیلنے میں
مصروف تھا۔ کہ یکایک ایک سیاہ فام کریہہ المنظر
دہقان اُس کے سامنے آ گیا۔ جنگلی کو دیکھ کر اس کا
گھوڑا بھڑکنے لگا۔ اور اس قدر بھڑکا۔ کہ بادشاہ زین
سے جدا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ عباس نے دہقان
کو منحوس صورت تصوّر کرکے نہایت غضب ناک ہو
کر قتل کرنے کا حکم دیا۔ لوگ جنگلی کو پکڑ کر قتل کرنے
کے لئے لے جانے لگے۔ بیچارے دہقان نے مؤدب
ہو کر نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ بادشاہ
سے عرض کیا۔ کہ جان لینے سے پہلے مجھے کم از کم
میرا قصور بتا دیجئے۔ کہ میں آخر کس گناہ یا غلطی کی
پاداش میں قتل کیا جا رہا ہوں۔ بادشاہ نے تند لہجے
میں جواب دیا۔ قصور کیا ہے؟ یہی کہ تو اپنا چہرۂ
نازیبا لے کر جونہی صبح میرے سامنے آیا۔ اور اس
کا منحوس اثر یہ ہوا۔ کہ میرا گھوڑا اس قدر بھڑکا کہ
میں گرتے گرتے رہ گیا ؎

دہقانی رونے لگا۔ اور جب کچھ آنسو رُکے۔ تو
اُس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا:۔ تو پھر حضور!
سرکار کے چہرۂ مبارک کو کیا تصور کرنا چاہئے۔ جس
کی زیارت مجھے خوش قسمتی سے آج صبح ہوئی۔ اور
جو اب ہلاکتِ جان کا سبب بنی ہوئی ہے ؎

بادشاہ عباس اس دیہاتی کی معقول جوابی سے متحیّر ہو گیا۔ اس کا غصّہ غضب طیش غیظ سب کچھ ترحم سے بدل گیا۔ اور اُس نے دہقانی کو قتل کرنے کے بجائے اُسے کثیر انعام دینے کا حکم دیا۔ شاہی فرمان کی ایک آن میں تعمیل کی گئی۔ اور غریب دہقان اپنا وہ انعام لے کر جس کا دوسرا رُخ اس کا قتل تھا۔ خوش خوش اپنے گھر چلا گیا *

"معقول جوابی میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ اور گفتگو کے فن میں حاضر جوابی کا بڑا درجہ ہے۔ جو بات سنو۔ دو تین منٹ اس پر غور کرو۔ اور اس کے بعد ایک معقول جواب دو۔ اگر تم نے ہر بات کا سوچ سمجھ کر جواب دیا۔ تو لوگ تمہاری عزت کریں گے۔ حاضر جوابی بڑی اچھی چیز ہے۔ لیکن اسی وقت تک جب تک کہ تہذیب کے دائرہ میں رہے *

ایک با اصول اخبار نویس

ڈاکٹر بنجمن فرینکلن امریکہ میں ایک بڑا عقل مند لائق اور با اصول اخبار نویس گذرا ہے۔ گو وہ مفلس

تھا۔ مگر اس کی علمیّت اور ذہنیّت کی مایا اُس کی مُفلسی کو دبائے ہوئے تھی ‡

ڈاکٹر بنجمن پہلے پہل تو بہت ہی غریب تھا۔ لیکن جب اُس نے مختصر سا اخبار اور چھوٹا سا پریس جاری کیا۔ تو اُس کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ لیکن کامیاب زندگی کا پھر بھی مالک نہ بن سکا۔ اور اُس کی بظاہر وجہ یہی نظر آتی تھی۔ کہ وہ بڑا منصف مزاج اور حقیقت پرست اخبار نویس تھا۔ اور اپنے اس اصول کی بنا پر اکثر اُسے اپنے دوستوں سے بھی اختلاف کرنا پڑتا تھا۔ اُس کے اُن دوستوں نے جنہوں نے اُسے اخبار کی اشاعت میں مدد دی تھی۔ کسی معاملے میں اُس پر بیجا دباؤ ڈالنا چاہا۔ جسے ڈاکٹر بنجمن نے گوارا نہ کیا۔ عام دوست اُس کے خلاف ہو گئے۔ ڈاکٹر بنجمن نے محسوس کیا۔ اور وہ اس وقت خاموش ہو رہا۔ تھوڑے دنوں کے بعد اُس نے اپنے دوستوں کی دعوت کی۔ دوست بادلِ ناخواستہ آ گئے۔ اور وقت مقررہ پر کھانے کا انتظار کرنے لگے۔ جب وقت گذرنے لگا۔ تو بعض نے اپنے مُنہ سے کھانا طلب کر لیا۔ ڈاکٹر بنجمن مکان کے اندر گیا۔ اور پانی سے بھرا ہوا ایک مٹی کا لوٹا اور ایک موٹی اور بھدی سی روٹی جو اس زمانے

میں انتہائی غریب لوگوں کی غذا تھی۔ اٹھا لایا۔ اور میز پر لا کر رکھ دی۔ دوستوں سے کہا۔ کہ کھاؤ۔ اے زبر دست آدمیو! کھاؤ۔ یہ کہتے ہوئے بنجمن اس موٹی روٹی میں سے توڑ کر کھاتا رہا۔ اور جتنی اسے بھوک تھی۔ اس کے مطابق کھا کر اُس نے مٹی کے لوٹے سے خوب تن کر پانی پیا۔ اور اُن سب بے وقوف دوستوں کو مخاطب کر کے ایک پُرجوش تقریر کی۔ جس میں انہیں سمجھایا۔ کہ جو انسان اتنی موٹی سُوکھی اور بھدّی روٹی اور ایک لوٹا پانی پی کر زندہ رہ سکتا ہے۔ اُسے کیا ضرورت ہے۔ کہ وہ اپنا ایمان دنیا کے ہاتھ فروخت کر دے۔ اور اُسے کیا ضرورت ہے۔ کہ وہ کسی تمنّا کی بنا پر سچّے راستے سے منہ موڑے اس کے دوست اُس کی تقریر سُن کر حیران اور دنگ رہ گئے۔ اور ڈاکٹر بنجمن کی تمام امریکہ اور دوسرے ملکوں میں صرف اسی واقعہ سے بڑی شہرت ہو گئی اور ہر شخص اُسے اور بھی عزت کی نگاہوں سے دیکھنے لگا

"اصول انسان کا بڑا جوہر ہے۔ اور منصف مزاجی دُنیا میں بڑی نعمت ہے۔ جو لوگ انصاف کو پسند کرتے ہیں۔ اُن کا ضمیر فرشتوں کی عبادت کی آواز ہے تم بھی ہمیشہ منصف بننے کی کوشش کرو۔ انصاف فطرت کا بے بہا عطیہ ہے"

ملاّح کی دانشمندی

اورنگ زیب بادشاہ ہندوستان کے بادشاہوں میں بڑا مشہور اور زبردست بادشاہ گذرا ہے۔ایک دفعہ دکن کی طرف سفر کر رہا تھا۔کہ اُسے ایک دریا عبور کرنا پڑا۔ شاہی فوج دریا کو عبور کرنے لگی۔اور اورنگ زیب ایک ملاّح سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ باتیں کرتے کرتے ملاّح نے بادشاہ سے کہا حضور دنیا میں کوئی جاندار شے نہیں۔جس کے وزن کا میں اندازہ نہ کر سکوں۔ بادشاہ نے کہا۔ اچھا ذرا بتاؤ تو۔کہ میرے اس ہاتھی کا وزن کیا ہے؟ بادشاہ نے اپنی خاص سواری کا ہاتھی ملاّح کے سامنے کر دیا۔ ملاّح نے کہا۔کہ اس کالے پہاڑ کو میری کشتی پر سوار کرا دیجئے۔ بادشاہ کی فوج نے ہاتھی کو کشتی پر چڑھا دیا۔

ہاتھی کے بار سے کشتی پر جو پانی کا نشان بنا۔ اُس پر عقلمند ملاّح نے ایک نشان اپنی طرف سے بھی بنا دیا۔کنارہ آیا۔ اور ہاتھی کو اُتار دیا گیا۔بادشاہ نے کہا۔بتاؤ۔ہاتھی کا کیا وزن تھا۔حضور ابھی بتاتا ہوں۔ ملاح نے یہ کہہ کر پتھر بھرنے شروع

گئے۔ اور جب اُس مقررہ نشان تک پانی چڑھ آیا۔ تو اُس نے وہ پتھر کشتی سے نکال لئے۔ اور پھر اُن پتھروں کا الگ الگ وزن کیا۔ پھر تمام وزن کو ایک حساب میں جمع کر دیا۔ اور بادشاہ کو جو وزن تھا۔ بتا دیا +

بادشاہ ملّاح کی اس دانشمندی اور عقلمندی پر بے حد خوش ہوا۔ اور اُسے اس دریا کے کنارے پر ایک گاؤں جاگیر کے طور پر دے دیا۔ جو اب تولاپور کے نام سے مشہور ہے +

"دانش مندی دانائی اور عقلمندی دُنیا میں کامیابی کی سیڑھیاں ہیں۔ جس انسان کے پاس یہ جوہر ہیں۔ وہ شہنشاہ بن سکتا ہے تاوقتیکہ کہ ملاح کی طرح مستعد بھی ہو۔ جس نے ہاتھی کے برابر پتھروں کو تولنے کی تکلیف گوارا کی +

ادائے فرض یا ماں باپ کی اطاعت

ایران کی ایک ریلوے لائن پر ایک شخص جسے ریلوے کی اصطلاح میں (Points man) کانٹے والا کہتے ہیں۔ اور جو گاڑی کے آنے کے لئے لائنوں کو

مرتب کیا کرتا ہے۔ کھڑا تھا۔ اور آنے والی گاڑی
کے لئے لائن کو ترتیب دینا چاہتا تھا۔ اس خیال
سے کہ جانے والی گاڑی سے آنے والی گاڑی کی
ٹکر نہ ہو جائے۔ اسی کشمکش میں اُس نے دیکھا۔ کہ اس
کا چھوٹا بچہ آنے والی گاڑی کی لائن پر کھیل رہا ہے
اس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ وہ اس حالت میں کیا
کر سکتا تھا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ وہ اپنے چھوٹے
بچے کی جان بچا سکتا تھا۔ لیکن اس حالت میں وہ ہزاروں
جانوں کا خون کرتا اور گاڑی اُلٹ جاتی۔ چونکہ وہ
بچے کو بچا کر لائن کو ٹھیک نہیں کر سکتا تھا۔ اس
کے لئے یہ بڑی پریشانی تھی۔ اور سچ مچ وہ ایک عظیم
مصیبت میں مبتلا تھا۔ تاہم اُس نے سب سے پہلے
فرض کو نظر انداز نہیں کیا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو چیخ
کر کہا :۔ "لائن پر لیٹ جاؤ!" اس کا بچہ جو فرمانبرداری
کا عادی اور اپنے باپ کا بڑا اطاعت گذار تھا۔ لائن
پر لیٹ گیا۔ اور اُس نے گاڑی کو بہ آسانی گذار دیا۔
بچے کے سینے پر سے ایک بوجھل لمبی اور شور مچانے
والی خوفناک گاڑی گذر گئی۔ مسافروں کو جو گاڑی
میں بیٹھے ہوئے خوش خوش باتیں کر رہے تھے۔ ذرا خبر
نہ تھی۔ کہ وہ ایک معصوم کے سینے کو روندتے ہوئے
گذر رہے ہیں۔

جب گاڑی گذر گئی۔ تو اپنے فرض کو مقدم سمجھنے والا باپ دوڑا دوڑا بیٹے کے پاس گیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ اپنے بیٹے کی کچلی ہوئی لاش کو اُٹھائیگا۔ لیکن اُس کی مسرّت اور خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب اُس نے دیکھا۔ کہ اُس کا بیٹا صحیح اور زندہ ہے +

کانٹے والے آدمی کی اس دلیرانہ منصفانہ اور بہادرانہ حرکت کی خبر بادشاہِ وقت کو بھی ہوئی۔ اور اُس نے عزّت کا سب سے بڑا تمغہ اُس کی بہادری کے صلے میں اُسے عطا کیا +

"دیکھو اطاعت گذاری کیسی اچھی چیز ہے۔ اگر وہ بچّہ اپنے باپ کے کہنے سے لائن پر نہ لیٹتا۔ تو کٹ کر مر جاتا۔ تم بھی ہمیشہ اپنے ماں باپ کی اطاعت کو اپنا فرض خیال کرو۔ دنیا میں جو انسان اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں"۔ اگر وہ شخص اپنا فرض ادا نہ کرتا۔ تو ہزاروں جانیں برباد ہوتیں۔ اور خود بھی مارا جاتا +

مردانہ استقلال

اٹلیا ایک مقام ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ

الپیا ریلوے لائن سے ایک اسپیشل ٹرین گذرنے والی تھی۔ کانٹے والا آدمی جس کا نام یوُینگ تھا۔ کانٹے پر تھا۔ جب اسپیشل ٹرین کا انجن کانٹے سے گذرنے لگا۔ تو کانٹے کے سوراخ سے ایک بڑا بھاری بھورا سانپ نکل کر کانٹے کے ڈنڈے پر چڑھ کر کانٹے والے کے ہاتھ پر چڑھا۔ اور سر اور پشت پر سے ہوتا ہوا زمین پر اُتر گیا۔

وہ خاص لوگ جو اسپیشل گاڑی پر سوار تھے۔ یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اور اپنی موت کو لبیک کہنے پر تیار سے ہو گئے تھے۔ کیونکہ انہیں یقین ہو گیا تھا۔ کہ کانٹے والا سانپ کے خوف سے اب کانٹا ہاتھ سے چھوڑ دے گا۔ اور واقعی اگر یوینگ کانٹا چھوڑ دیتا۔ تو گاڑی کے ٹکڑے ہی ٹکڑے ہو جاتے۔ مگر یوُینگ شیر دل بہادر کانٹے کے ڈنڈے کو پکڑے ہی رہا۔ اور بالکل بے حس و حرکت کھڑا رہا یہاں تک کہ ٹرین گذر گئی۔ اور سانپ بھی اُس کے جسم پر سے اُتر کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اور جب اُس نے کانٹا چھوڑ کر دیکھا۔ تو سانپ کا کہیں پتہ ہی نہ تھا۔ لوگوں نے جو یہ خوفناک تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جلدی سے آکر پوچھا۔ کہ سانپ نے کاٹا تو نہیں۔ تو یوُینگ بہت مُسکرایا۔ آخر مجمع سے ایک

آدمی نے کہا :-
اور جو وہ کاٹ لیتا - تو بچہ سیدھے ہی سدہار جاتے +

یوُ ینگ :- جناب وہ کاٹ کیوں لیتا ؟ اگر میں ذرا بھی ہلتا - تو یقیناً وہ مجھے کاٹ لیتا - اور اگر میں کانٹا چھوڑ دیتا - تو اسپیشل ٹرین تباہ ہو جاتی اور تمام مسافر ہلاک ہو جاتے +

جب لوگوں نے اس کی زبان سے یہ الفاظ سُنے - تو اُس کی بہادری کی بے حد تعریف کی - اور اُس کی ترقی بھی ہو گئی +

"کسی سے لڑائی لڑ کر اُسے پچھاڑ دینا مردانگی اور بہادری نہیں - بلکہ بہادری مردانہ استقلال ہی کو کہتے ہیں - اور مردانہ استقلال کی مثال کانٹے والے کی سچی کہانی ہے +

مصیبت کے وقت ہمیشہ مستقل مزاج رہو - مصیبت کبھی اپنا اثر نہ کرے گی +

دیوان ساون مل کا انصاف

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں دیوان ساون مل

ملتان کے گورنر تھے۔ ان کے انصاف اور اخلاق کی بدولت غریب آدمیوں کو اُن کے عہد میں کوئی شکایت نہ ہوئی +

ایک دفعہ کیا ہوا۔ کہ اُن کے لڑکے نے کسی زمیندار کے کھیت میں جا کر کچھ گنے کٹوا لئے۔ کسی نے جا کر دیوان صاحب سے کہہ دیا۔ دیوان صاحب کا سننا تھا۔ کہ غصّہ کے مارے لال ہو گئے۔ اور فوراً اپنے بیٹے کو بلا کر کہا :-

"تم کھیت میں کیوں گئے تھے ؟

اُن کے لڑکے یہ سُن کر خاموش ہو گئے۔ اس خاموشی پر دوسرا باپ تو خاموش ہو جاتا۔ لیکن دیوان صاحب نہ مانے۔ اور وہ کیا نہ مانے۔ اُن کی منصف مزاجی نہ مانی۔ فوراً اپنے بیٹے سے کہا۔ دھوپ میں بندوق لے کر کھڑے ہو جاؤ +

وہ بیچارہ معمولی اردلی سپاہیوں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اور کئی گھنٹے کھڑا رہا۔ بہت سے آدمیوں نے سفارشیں کیں۔ خود وہ زمیندار جس کے کھیت کے گنے اُن کے بیٹے نے توڑے تھے۔ دیوان صاحب کے پیروں پر گر پڑا۔ اور معافی مانگنے لگا +

یہ تو تم بھی جانتے ہو گے۔ کہ ملتان میں کیسی آگ سی دھوپ پڑتی ہے۔ دیوان صاحب کا لڑکا

دھوپ میں کئی گھنٹے کھڑا رہا۔ اور کہتے ہیں۔ کہ وہ دھوپ کی سختی برداشت نہ کر سکا۔ اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد سخت بیمار ہو کر مر گیا +

وہ تو مرنے کو مر گیا۔ لیکن اس کا اثر یہ ہوا۔ کہ دیوان صاحب کے مرنے کے بعد بھی ملتان کی فضا سے انصاف کے اثرات نہ مٹے۔ ہر شخص منصف مزاجی کو اچھا سمجھتا تھا۔ اور کسی کو اتنی جرأت نہ ہوتی تھی۔ کہ کوئی بات انصاف کے خلاف کہے +

"دیوان صاحب کے قصّے سے تم بھی انصاف کا سبق لو۔ اور ہمیشہ انصاف کو مدِّنظر رکھو"+

سر سیّد اور اُس کی والدہ

ہندوستان میں کون ایسا شخص ہے۔ جو سر سیّد احمد خان کا نام نہیں جانتا۔ وہ علی گڑھ کالج کے بانی تھے۔ وہی علی گڑھ کالج جو ترقی کرتے کرتے آج مُسلم یونیورسٹی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے +

اُن کی والدہ کا نام عزیز النّسا بیگم تھا۔ جو دہلی کے ایک معزز کاشمیری خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ دہلی کے بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے وزیر نواب دبیرالدّولہ خواجہ فریدالدّین احمد خاں بہادر مصلح جنگ کی سب سے

بڑی صاحبزادی تھیں +

سر سید احمد نے ہندوستان میں اپنے مذہبی اور تعلیمی اور ملکی خیالات کی بدولت جو شہرت حاصل کی۔ وہ بہت کچھ اُن کی والدہ عزیز النسا بیگم کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھی۔ جس کا سر سید احمد نے بارہا اپنے دوستوں کے سامنے ذکر کیا ہے +

سر سید کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے جس پر میرے کئی احسان تھے۔ مجھ سے دغا بازی کا سلوک کیا۔ اس کے خلاف تمام ایسے ثبوت موجود تھے۔ کہ مقدمہ کرنے پر عدالت سے اس کو سزا مل سکتی تھی۔ اور جب میں نے انتقام لینے پر آمادگی ظاہر کی۔ تو میری والدہ نے یہ کہہ کر مجھے روک دیا۔ کہ اگر تم اس کو معاف کر دو۔ تو اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں۔ اور اگر اس کو سزا ہی دلوانی ہے۔ تو اُس سے دلواؤ جو حاکموں اور عدالتوں کو بھی ان کے اعمال کی سزا دینے والا ہے۔ وہ خود اس کو سزا دے دیگا +

سر سید کہتے ہیں۔ میرے دل پر اس نصیحت کا ایسا اثر ہوا۔ کہ میں نے نہ صرف اس شخص سے بلکہ ہر ایسے شخص سے جس سے مجھے کچھ بھی رنج پونچتا۔ بدلہ

لینے کا خیال چھوڑ دیا۔
سرسیّد نے اسی قسم کے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جب میری عمر گیارہ برس کی تھی میں نے اپنے ایک پُرانے اور بوڑھے نوکر کو کسی بات پر خفا ہو کر تھپڑ مارا۔ میری والدہ کو خبر ہوئی۔ انہوں نے ناراض ہو کر مجھے گھر سے نکال دیا۔ چنانچہ تین دن میں اپنی خالہ کے پاس چھُپا رہا۔ چوتھے دن میری خالہ میرا قصور معاف کرانے کے لئے مجھے میری والدہ کے پاس لے گئیں۔ اُنہوں نے کہا۔ اگر اُس نوکر سے قصور معاف کرائے تو میں مُعاف کروں گی۔ وہ نوکر ڈیوڑھی پر بلایا گیا۔ جب میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے اور اُس کے سامنے اپنی حرکت پر ندامت کا اظہار کیا۔ تو میری والدہ نے بھی میری تقصیر معاف کی۔
سرسیّد کے ایک دوست تھے۔ کبھی یہ اُن کے ہاں جایا کرتے۔ کبھی وہ سرسیّد کے مکان پر ملنے کو آیا کرتے۔ لیکن اتفاق سے وہ دوست ناراض ہو گئے اور اُنہوں نے ملنا جُلنا چھوڑ دیا۔ سرسیّد نے بھی تھوڑے دنوں کے بعد اپنے دوست کے ہاں جانا ترک کر دیا۔ سرسیّد کی والدہ کو خبر ہوئی۔ اُنہوں نے سبب دریافت کیا۔ سرسیّد نے جو بات تھی۔ صاف صاف کہہ دی۔ سرسیّد کی والدہ نے کہا۔ نہایت افسوس

ہے۔ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے۔ وہی بات تم بھی کرتے ہو۔ تم اپنی دوستی کے فرائض پورے کرو۔ تم کو اس سے کیا۔ کہ دوسرا بھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں +

سنہ ۱۸۲۷ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جب یہ سُنا۔ کہ نواب دبیر الدّولہ نے اکبر شاہ کی وزارت سے استعفےٰ دیدیا ہے۔ تو اُس نے اپنے چند معتمدوں کے ہاتھ سفر خرچ کے طور پر بیس ہزار روپے نواب دبیر الدّولہ کے پاس بھیجے۔ اور اپنے معتمدوں کو یہ تاکید کی۔ کہ جس طرح ہو۔ ان کو وزارت پنجاب کے لئے آمادہ کر کے ہمراہ لے آؤ۔ نواب دبیر الدّولہ اور اُن کے تمام خاندان کی یہ خواہش تھی۔ کہ اُس بے مثال عزّت کو جو کسی کوشش اور وسیلہ کے بغیر حاصل ہو رہی ہے۔ قبول کر لینا چاہئے۔ لیکن اس موقعہ پر صرف ان کی بڑی بیٹی عزیز النّسا بیگم ہی ایسی تھی۔ جس نے جرأت اور دلیری کے ساتھ مخالفت کی۔ اور کہا۔
"خدا نے مال و دولت آپ کو اس قدر دیا ہے۔ کہ آپ کی کئی پشتیں بہ آرام گذارہ کر سکتی ہیں۔ اور اگر اس سے زیادہ دولت بھی جمع ہو جائے۔ تو بھی موجودہ آرام و آسائش میں کچھ اور زیادتی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر عزّت کی طرف دیکھا جائے۔ تو خدا کا فضل

شامل حال ہے۔ سب جگہ رسوخ اور وقعت ہے۔ اس ضعیفی کے عالم میں لاہور جانا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بادشاہی کے اختیارات لینا۔ اور ہم سب کا یہاں انگریزی علاقہ میں رہنا۔ مصلحت سے دُور ہے۔ معلوم نہیں۔ کل پنجاب میں کیا حادثات پیش آئیں۔ اور دہلی کی بادشاہی میں کیسے اتفاقات گزریں۔ ان حالات میں آپ کا دہلی چھوڑ کر لاہور جانا مجھے کسی طرح بھی پسند نہیں۔ دور اندیش بیٹی کی اس تقریر کا باپ کے دل پر ایسا اثر ہوا۔ کہ اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سفرخرچ واپس اور وزارت پنجاب کے عہدہ سے انکار کر دیا۔

"بچو! جو ماں ایسی بااخلاق رحمدل اور عالی دماغ ہو۔ اُس کا بچہ کیسا کچھ بااخلاق اور مدبّر نہ ہوگا۔ اور جس باپ کو ایسی دُور اندیش بیٹی ملی ہو۔ اس کی خوش نصیبی کا کیا کہنا۔ تم بھی اپنا فرض ادا کرنا اور انتقامی جذبات سے بچنا۔ اور اپنے نوکروں پر رحم کرنا سیکھو سر سیّد احمد خان نے اپنی ماں کے اعلیٰ اخلاق ہی کو دیکھ کر یہ کہا تھا۔ جو آج تک بطور ضرب المثل مشہور ہے۔ کہ " بلاشبہ ایک اچھی ماں ہزار اُستادوں سے بہتر ہے۔"

ایک غریب لوہار کی نورانی ایجاد

بجلی[1] کو تو جانتے ہی ہو۔ یہی بجلی تمہارے گھروں میں چراغ اور لالٹین کی جگہ جلتی ہے۔ یہ حال ہی کی ایجاد ہے۔ اور سچ تو یہ ہے۔ اس وقت جتنا فائدہ عام خاص سب کو بجلی سے پہنچا ہے۔ اتنا فائدہ زمانہ حال کی کسی ایجاد سے نہیں پہنچا۔ مکان دکانیں۔ بازار۔ سڑکیں ہر جگہ بجلی ہی بجلی نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں تو خیر اب بھی بہت سے شہر اور شہروں میں بہت سے گھر ایسے ہیں۔ جن میں ابھی بجلی کا گذر نہیں ہوا۔ مگر یورپ میں تو گاؤں گاؤں بجلی پہنچ گئی ہے۔ اور اس کی بدولت رات کے وقت یورپ کے سارے شہر اور دیہات بقعہ نور معلوم ہوتے ہیں۔ بجلی سے ہمیں صرف روشنی ہی حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ ہوا کے پنکھے۔ بے شمار کارخانے۔ ہزاروں فیکٹریاں۔ ٹرام بجلی کی ریل۔ ٹیلیفون۔ ٹیلیگراف۔ بے تار کی تار برقی۔ (وائرلیس) وغیرہ کتنی چیزیں ہیں۔ جن کا دارومدار بجلی پر ہے۔ اور جو بجلی کے ذریعے چلتی ہیں۔ یہ سب فائدے ہمیں کس کی بدولت حاصل ہوئے؟

[1] یہ حالات رتن ممون جولائی ۱۹۲۵ء کے ایک مضمون "از الفت انوری سیالکوٹی" سے لئے گئے ہیں۔

مائیکل فیریڈے کی بدولت۔ جس کا حال ہم آگے بیان کریں گے۔ یہ مائیکل فیریڈے ہی ہے۔ جس نے اپنی عجیب و غریب ایجادوں کے ذریعے بجلی جیسی عظیم الشان طاقت کو انسان کا غلام بنا دیا +

مائیکل فیریڈے ۱۷۹۱ء میں انگلستان کے ایک ضلع سرے کے دیہات نیونگٹن میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ لوہار تھا۔ اور بہت غریبی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ ۱۸۰۱ء میں جب انگلستان میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا۔ تو مائیکل ایک ڈبل روٹی پر چھ دن گذارہ کرتا تھا

تھوڑی سی تعلیم دلوانے کے بعد اُس کے باپ نے اُس کو نوکر کرا دیا۔ اس نے کتابیں بیچنے کا کام بھی کیا کتابوں کی جلد بندی بھی کی۔ اور شہر میں پھر کر اخبار بھی بیچتا رہا۔ لیکن اُس کو مطالعہ اور سوالات کرنے کی عادت کے ساتھ سائنس کے تجربوں کا بڑا شوق تھا۔ روزانہ جو کچھ پیسے اس کے پاس بچ رہتے۔ وہ ان ہی تجربوں پر خرچ کرتا۔ اس نے سب سے پہلے جو بجلی کی مشین بنائی۔ وہ ایک معمولی بوتل کی تھی +

اس کے اس شوق کو دیکھ کر اس کے بھائی نے اس کی ہمت بندھائی۔ اس زمانے میں سائنس کے مضمون پر سائنسدانوں کی تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ اور اُن کی فیس مقرر تھی۔ مائیکل ان تقریروں میں شامل ہونا

چاہتا تھا۔ مگر فیس نہ دے سکتا تھا۔ یہ کام اُس کے بھائی نے جو لوہار تھا۔ اپنے ذمہ لیا۔ وہ اُس کی فیس ادا کر دیتا تھا۔ اسی طرح ایک اور شخص نے بھی اس کی مدد کی۔ اور اس زمانے کے مشہور سائنسدان سر ہمفری ڈیوی کی تقریریں سننے کا سامان پیدا کر دیا۔ ان تقریروں کو وہ بہت غور سے سنتا۔ اور گھر آکر ان کا خلاصہ لکھ لیتا تھا۔

اس کا یہ شوق روز بروز ترقی کرتا گیا۔ آخر ۱۸۱۳ء کے بعد اُسے جلد سازی کے کام سے چھٹی ملی۔ اور وہ اپنی ہمت اور کوشش سے سر ہمفری ڈیوی کا مددگار بن گیا۔ سر ہمفری ڈیوی نے جب یورپ کے بہت سے ملکوں کا چکر لگایا۔ تو اس کا نوجوان اور نو عمر مددگار (مائیکل) بھی ساتھ تھا۔ لنڈن میں واپسی کے بعد سر ہمفری ڈیوی کی سفارش سے اسے اور بڑا عہدہ ملا۔ ڈیوی نے اُسے آمادہ کیا۔ کہ وہ اب خود اپنے طور پر تجربے کرتا رہے۔ اِس سے اُس کی اور بھی ہمت بڑھی۔ اور اس زمانے میں اُس نے بہت سی نئی باتیں دریافت کیں۔ اس عرصے میں اس نے وہ اہم ایجادیں کیں۔ جن میں سے چند کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ اس کی یہ ایجادیں اتنی مفید تھیں۔ کہ اگر وہ ان سے روپیہ کمانا چاہتا۔ تو کروڑپتی

بن جاتا۔ مگر اُس نے اس بات کو گوارا نہ کیا۔ اور ان ایجادوں کا نفع سب کے لئے عام کر دیا۔ حکومت نے اس کی خدمت کے صلہ میں اس کو سر کا خطاب دینا چاہا۔ مگر اُس نے خطاب قبول کرنے سے انکار کر دیا

اسے بچّوں کی تعلیم کا بھی بڑا خیال تھا۔ بڑے دنوں کی چھٹیوں میں وہ بچوں کے لئے سائنس پر لکچر دیتا۔ ان لکچروں کا سلسلہ اب تک قائم ہے +

۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریا نے اسے ہمپٹن کورٹ میں ایک خوبصورت مکان رہنے کو دیا۔ اپنی عمر کا آخری حِصّہ اُس نے یہیں گذارا۔ اور یہیں ۱۸۶۷ء میں انتقال کر گیا +

"دیکھئے ایک غریب اور معمولی لوہار کے لڑکے نے محض اپنے شوق اور ہمّت کی بدولت کیسے کیسے کام کئے۔ جن سے ساری دُنیا کو نفع پہنچا۔ اور پھر کیسا رتبہ اور عزت حاصل کی۔ خدا کرے۔ تم میں بھی یہ ہمّت اور ولولہ پیدا ہو۔ اور تُم سے بھی ایسے ہی کام بن آئیں۔ جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے والے ہوں +"

مؤدبانہ گفتگو کا آزادانہ طریقہ

آج سے قریباً بارہ سو سال پیشتر عرب میں ابو جعفر منصور[1] کے نام سے ایک خلیفہ گذرا ہے۔ جو عباسیہ خاندان کا دوسرا بادشاہ تھا۔ یہ بادشاہ بڑا سخت گیر نہایت بخیل اور بے حد کنجوس تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ نہایت عادل اور منصف مزاج تھا۔ جب اسے کسی صوبہ کے گورنر یا کسی اور امیر وزیر کی زیادتی اور ناانصافی کی خبر ہوتی۔ وہ اس کی اچھی طرح چھان بین کرتا۔ اور اگر اپنے کسی ماتحت کا قصور دیکھتا۔ تو بلا تامل اس کو سزا دیتا۔ اور سزا دیتے ہوئے اس کے عہدہ اور اس کے رعب داب کا کوئی لحاظ نہ کرتا۔

لکھا ہے۔ کہ اس کے عہد میں اس کے ایک گورنر نے ایک شخص کی زمین زبردستی چھین کر۔ اپنے قبضہ میں کر لی۔ وہ بہت رویا پیٹا۔ لیکن نہ گورنر کے ماتحتوں نے گورنر کے لحاظ سے اس کی فریاد سنی۔ اور نہ گورنر نے کوئی توجہ کی۔

[1] تخت نشینی ۱۳۶ھ وفات ۱۵۸ھ مدت حکومت ۸ سال

سب طرف سے نا امید ہو کر وہ خلیفہ کے پاس انصاف اور عدل حاصل کرنے کے لئے دار الخلافہ میں آیا لیکن بادشاہ کی حضوری کوئی آسان بات نہ تھی۔ وہ کئی دن تک امیروں وزیروں کے پاس بھٹکتا رہا۔ اور آخر کسی نہ کسی طرح بادشاہ تک اس کی رسائی ہو گئی خلیفہ نے کہا۔ کہو کس مطلب کے لئے آئے ہو؟ اس شخص نے عرض کیا۔ حکم ہو تو پہلے اپنا مقصد بیان کروں۔ یا مقصد بیان کرنے سے پہلے کوئی مثال حضور کی خدمت میں پیش کروں +

خلیفہ نے کہا۔ بہت اچھا پہلے کوئی مثال ہی بیان کرو +

اُس نے عرض کیا۔ بچہ جب چھوٹا ہوتا ہے۔ تو وہ اپنے دُکھ درد کی فریاد اپنی ماں کے پاس لے جاتا ہے۔ بہ اس لئے۔ کہ اپنی سمجھ کے مطابق وہ اُس وقت اپنی ماں کو ہی سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مہربان جانتا ہے۔ پھر جب زیادہ بڑا ہو جاتا ہے۔ تو اُس کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ماں کے علاوہ ایک اور وجود بھی میرا شفیق ہے۔ جس کو وہ باپ کے نام سے پکارتا ہے۔ چنانچہ ماں کے بعد وہ اپنی فریاد اپنے باپ کے پاس لے جاتا ہے۔ لیکن جب وہ جوان ہو جاتا ہے۔ تو اپنی شکائتیں حاکم شہر کی عدالت میں پیش

کرتا ہے۔ کیونکہ قانونی طور پر وہ اُسی کو سب سے زیادہ قوی سمجھتا ہے۔ لیکن جب حاکم شہر بھی اس کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے ساتھ تکبّر اور غرور سے پیش آتا ہے۔ اور اس کو حقیر سمجھ کر پاؤں کے نیچے روندنا چاہتا ہے۔ تو پھر وہ مظلوم شخص اپنے بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونے کی کوشش کرتا ہے بادشاہ تک پونچنے کے لئے اُس کے رستے میں کئی روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ بادشاہ کے خوف سے اُس کو ڈرایا جاتا ہے۔ اور اس بات سے کہ گورنر جیسے عالی رُتبہ حاکم کے مقابلہ میں تم جیسے معمولی انسان کی کیا شنوائی ہوگی۔ اس کو انصاف حاصل کرنے سے مایوس کیا جاتا اور اُس کی ہمّت توڑی جاتی ہے۔ لیکن ان مشکلوں کے باوجود وہ مظلوم بادشاہ تک پونچ ہی جاتا ہے۔ مگر جب اُس بدنصیب کی چیخ پکار بادشاہ بھی نہیں سُنتا۔ تو پھر وہ اپنی عاجزانہ دعاؤں کے ساتھ گڑگڑاتا ہوا اُس بادشاہوں کے بادشاہ اور شہنشاہوں کے شہنشاہ کے پاس اپنی فریاد لے جاتا ہے۔ جس کے نزدیک حاکم و محکوم غریب و امیر اور بادشاہ و فقیر میں کوئی فرق نہیں۔ جو کسی کے جاہ و جلال کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ اس کے اعمال کو دیکھتا ہے۔ اگر اس کے عمل دنیا میں اچھے رہے ہیں۔ اُس نے کسی کا دل نہیں دُکھایا۔

کسی کے ساتھ نا انصافی نہیں کی - تو وہ ضرور اُس ذاتِ پاک کا قرُب حاصل کرے گا - خواہ وہ ایک ادنیٰ فقیر ہی کیوں نہ ہو - اور اگر وہ اپنی حکومت اور اپنی زبردستیوں کے گھمنڈ میں غریبوں کا دل دُکھاتا ہے - دولت کو عیش و عشرت میں برباد کرتا ہے - اور بادشاہ اور حاکم ہو کر غریب رعایا کے ساتھ ظلم کرتا ہے - تو وہ خدا کے نزدیک ایک چوہڑے چمار سے بھی جو بُرائیوں سے پاک ہے - ذلیل درجہ رکھتا ہے -

خلیفہ کے دل پر اس تقریر کا ایسا اثر ہوا - کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے - اور اس کا دل لرز اُٹھا - اُس نے کہا - اے شخص اب اپنی تقریر بند کر - کہ مجھے اس سے زیادہ سُننے کی تاب نہیں ہے - تو بتا - کہ تیرے ساتھ کیا ظُلم ہوا ہے ؟

اُس شخص نے کہا - امیرالمؤمنین - میرے قبضہ میں زمین کا ایک بہت اچھا زرخیز رقبہ تھا - اس رقبہ کی سرسبزی و شادابی دیکھ کر آپ کے گورنر نے مجھ پر ستم توڑنے شروع کئے - یہاں تک کہ اپنے ماتحت اہل کاروں کے ذریعہ اس نے وہ وسیع رقبہ اپنے قبضہ میں کر لیا ہے - میں ایک سال سے زیادہ عرصہ سے در بدر پھر رہا ہوں - کوئی میری فریاد نہیں سُنتا - اب حضور کے پاس حاضر ہوا ہوں - کیا حضور انصاف کرینگے

یا میں اس حاکم کے پاس جاؤں۔ جو مظلوموں کی فریاد کے استقبال کے لئے اپنی بارگاہ سے قبولیت کو بھیج دیتا ہے +

خلیفہ نے اس کو اطمینان دلایا۔ کہ میں اس معاملہ میں ضرور انصاف کرونگا۔ چنانچہ کسی مزید تحقیقات کے بغیر گورنر کو حکم بھیجا۔ کہ فوراً اس کی زمین واپس کر دی جائے +

"بچو! دیکھو حق و راستی اور ادب و تمیز کی اس دلیرانہ گفتگو نے اس بے وسیلہ و مظلوم شخص کو انصاف اور عدل حاصل کرنے میں کتنی مدد دی۔ گفتگو کا بھی ایک سلیقہ ہوا کرتا ہے۔ تم بھی اس سلیقہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرو"

دشمن وطن کو عورت کا دلیرانہ جواب

جب پیرس کا محاصرہ فریڈرک ولیعہد جرمنی نے جو آج کل قیصر ہے کر رکھا تھا۔ تو پیرس والوں کے لئے بڑی مصیبت کا سامنا تھا۔ کوئی ڈر کی وجہ سے گھر سے باہر قدم نہ رکھتا تھا۔ سب نے اپنے اپنے کام چھوڑ دیئے تھے +

لیکن روزا پیرس کی مشہور مصورہ (تصویر کھینچنے والی) کے دل پر اس محاصرہ کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔ گو وہ شہر کے بڑے مخدوش حصے "فونٹین بلیو" میں رہتی تھی۔ مگر برابر اپنا کام کرتی تھی۔ اور ذرا خوف کو دل میں نہ لاتی تھی +

ایک دن فریڈرک اُس کے مکان پر ایک فوجی دستے کے ہمراہ روزا کی ملاقات کے لئے آیا۔ اُس نے اپنا گھوڑا روزا کے مکان کے صحن میں روک لیا۔ اور گھوڑے سے اُتر کر کہلا بھیجا۔ کہ وہ روزا سے ملاقات کرنا اور اُس کی تصویریں دیکھنا چاہتا ہے۔ اور اُس نے یہ الفاظ بڑے شوق اور تہذیب سے اپنی زبان سے نکالے +

ملازم نے روزا کو فریڈرک کا پیغام پونچایا۔ قیصر کا پیغام سُن کر دوسری عورت ہوتی تو کانپ جاتی مگر روزا پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور اُس نے بلا خوف جواب دیا۔ کہ شہزادہ سے کہدو۔ کہ وہ اگر تصویریں دیکھنا چاہتا ہے۔ تو تصویروں کے کمرے میں جا کر دیکھ سکتا ہے میں ہرگز اُس شخص سے ملنا گوارا نہیں کرتی۔ جس نے میرا مُلک فتح کر لیا ہے +

فریڈرک یہ جواب سُن کر بے حد متعجب ہوا۔ کچھ سمجھ نہ سکا۔ اور سٹ پٹا سا گیا۔ اور چند منٹ تک

کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ وہ صحن میں کھڑا ہوا اس معمولی عورت کے جواب پر غور کر رہا تھا۔ کبھی وہ اپنے فوجی دستے کی طرف دیکھتا تھا۔ اور کبھی اپنی طرف دیکھ کر غصہ سے لرز جاتا تھا +

آخر اُس نے ملازم کو آواز دی۔ اور پاس بلا کر کہا۔ جاؤ۔ روزا سے کہو۔ کہ :-

واقعی تم ایک بہادر شجیع اور مکمل عورت ہو اس وقت تک فرانس میں مجھے کوئی شخص ایسا نظر نہیں آیا۔ جو میرے پاس ایک دستہ فوج دیکھنے کے باوجود مجھے اس طرح جواب دے سکے +

یہ کہہ کر وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور اپنے فوجی دستے کے ساتھ واپس چلا گیا +

" دیکھا بچو ! بہادری اس کا نام ہے۔ اور وطن کی محبت اسے کہتے ہیں۔ ہم تمہیں ایک بات بتاتے ہیں۔ بس اسے گرہ میں باندھ لو۔ جو شخص اپنے وطن سے محبت رکھتا ہے۔ وہ غلام رہنا کبھی پسند نہیں کرتا +

محمود غزنوی اور ایک نیاریا

ایک مرتبہ سلطان محمود غزنوی نے ایک ندی کے کنارے مٹی کے چھوٹے چھوٹے تودے دیکھے۔ جو کسی نیاریئے نے خاک چھان چھان کر لگا رکھے تھے۔ سلطان کو اس کی اس محنت اور غربت پر بڑا رحم آیا۔ اُس نے دل میں کہا۔ اتنی سخت محنت کے باوجود بھی خدا جانے اس غریب کو اس میں سے کچھ ملے گا یا نہیں۔ یہ خیال جونہی اس کے دل میں آیا۔ وہ ان تودوں پر کچھ اشرفیاں پھینکتا ہوا چلا گیا۔ چند دنوں کے بعد شام کے قریب سلطان محمود کا پھر اسی رستے سے گذر ہوا۔ وہ کیا دیکھتا ہے۔ کہ نیاریا اپنے کام میں برابر مصروف ہے۔ اور خاک چھان چھان کر تودے لگا رہا ہے۔ سلطان نے اس نیاریئے سے کہا۔ چند دن ہو گئے۔ جو اشرفیاں تم کو ان تودوں سے ملی ہیں۔ میرے خیال میں اِن کے ذریعہ تم امیرانہ ٹھاٹھ سے گذارہ کر سکتے ہو۔ کیا تمہارا لالچ تم کو گھر بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ نیاریئے نے کہا۔ مجھ کو جو کچھ ملا ہے۔ اسی خاک سے ملا ہے۔ جب میری قسمت کا ستارہ اسی خاک

کے ذرہ سے آفتاب بنا ہے۔ تو مَیں اپنے اس قدیم پیشہ کو جو میری حلال محنت کی کمائی کا ذریعہ ہے۔ کیوں ترک کروں ؛

"یہ مختصر سا واقعہ ان بچّوں کے لئے کِتنا نصیحت آموز ہے۔ جو تھوڑا سا علم پڑھ کر اپنے آبائی پیشہ کو ترک کرکے دھوبی کے کُتّے کی طرح نہ گھر کے رہتے ہیں۔ نہ گھاٹ کے ؛

اگر لکھے پڑھے لڑکے اپنے باپ دادا کے کاموں کو اپنے علم کے ذریعہ ترقی دینا چاہیں اور کوئی شرم محسوس نہ کریں۔ تو وہ نوکری اور ملازمت کی نسبت جو درحقیقت غلامانہ ذہنیت قبول کرنے کی ابتدائی سیڑھی ہے۔ آزادی کے ساتھ اپنی روزی پیدا کر سکتے ہیں" ؛

جاپانی اُستاد اور جاپانی بچّے

دیکھتے ہو۔ جاپان نے پچاس ساٹھ سال ہی کے عرصہ میں کس قدر ترقی کر لی ہے۔ ایک چھوٹے سے مُلک نے رُوس جیسی عظیم الشّان سلطنت کو ۱۹۰۵ء

میں کس قدر شکست فاش دی۔ اس کے حالات بھی لوگوں کو معلوم ہیں۔ اس لڑائی میں جاپانیوں نے اپنے وطن کی محبت اور اپنے مُلک کے لئے جان قربان کرنے کا جو ثبوت دیا تھا۔اس کی مثالیں بہت کم مُلکوں میں مل سکتی ہیں ؞

جاپان کی ترقی کا راز فیشن کی غلامی نہیں ہے۔ بلکہ اس کی تعلیم جاپان کے سکولوں میں دی جاتی ہے۔ جہاں بتایا جاتا ہے۔ کہ یورپ اور دیگر مغربی ملکوں میں جو اچھی باتیں ہیں۔ جن سے عقل بڑھتی ہے۔ دماغ روشن ہوتا ہے۔ اور مُلک ترقی کرتا ہے۔ ان کو اختیار کرو۔ اور جن باتوں سے مُلک جہالت میں گرفتار ہوتا ہے۔ جو ملک کی بدنامی کا باعث ہوتی ہیں۔ جن کو اختیار کرنے سے قوم کی دولت مُلک سے باہر جاتی ہے۔ اِن سے کنارہ کشی اختیار کرو۔ اور جب مُلک پر مصیبت آئے۔ تو اس کی عزت و حرمت کو بچانے کے لئے اپنا تن من دھن نثار کر دو ؞

چنانچہ ہم مثال کے طور پر یہاں جاپان کے ایک اُستاد اور اس کے ایک شاگرد کے سوال جواب لکھتے ہیں جن کا لفظ لفظ غور اور عمل کے قابل ہے ؞

اُستاد۔ تمہاری عمر کیا ہے ؟

بچہ۔ چودہ سال ؞

اُستاد۔ تم اتنے بڑے اور موٹے تازے کیونکر ہو گئے؟
بچہ۔ خوراک کی بدولت ؛
اُستاد۔ یہ خوراک کہاں سے آئی ؟
بچہ۔ ہمارے ملک کی زمین سے ؛
اُستاد۔ تمہارے ماں باپ میں طاقت کہاں سے آئی۔ جن کی بدولت تم پیدا ہوئے ؟
بچہ۔ اُس غذا سے جو جاپان کی زمین سے نکلی ؛
اُستاد۔ کیا تمہارا جسم جاپان ہی کی مٹی سے پھلا پھولا ہے ؟
بچہ۔ جی ہاں ؛
اُستاد۔ تمہارے جسم پر کپڑا کس ملک کا ہے ؟
بچہ۔ جاپان کا ؛
اُستاد۔ تمہارے گھر میں کوئی ایسی چیز بھی ہے۔ جو کسی غیر ملک سے آئی ہو ؛
بچہ۔ ہمارا ملک کون سی چیز نہیں بنا سکتا ؟ پھر ہمیں اوروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کی کیا ضرورت ہے !
اُستاد۔ جس مُلک نے تمہارے ماں باپ کو پیدا کیا۔ تم کو پیدا کیا۔ تمہیں اور تمہارے بڑوں کو جس نے پالا۔ جس کے نام پر تم کو فخر ہے۔ کیا اس کا کوئی حق تم پر نہیں ہے ؛

بچہ۔ کیوں نہیں ہماری جان بھی اس کے لئے حاضر ہے۔ ہم اس کی عزت اور حفاظت کے لئے وقت آنے پر اپنا خون پسینہ ایک کر دینے کو تیار ہیں +

اُستاد۔ کیا جاپان کو اختیار ہے۔ جب مناسب سمجھے۔ تمہارا جسم لے لے +

بچہ۔ جی ہاں! مجھے کوئی عذر نہ ہوگا +

"بچو! اتنی اور اسی قسم کی مختصر سی بات چیت سے جاپان کے ننھے ننھے بچوں کے رگ و ریشہ میں وطن کی محبّت اور جان نثاری کا خیال پیدا کیا جاتا ہے۔ اور ملک کی اشیاء کو ترقی دینے کے گرُ بتائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آج جاپان تجارتی دَوڑ میں قریباً سب سے بازی لے جا رہا ہے +

مبارک ہیں وہ چھوٹے بچّے جن کے دماغوں میں ملکی ترقی کی باتیں سما جاتی ہیں۔ اور پھر وہ ان پر عمل بھی کرتے ہیں +"

جاں نثار وزیر کا بلیدان

۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۶ء کے ایّام پنجاب والوں پر بڑی مصیبتوں کے دن تھے۔ اس زمانہ میں پنجاب کا حکمران کہنے کو تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا سب سے چھوٹا بیٹا مہاراجہ دلیپ سنگھ تھا۔ لیکن در اصل حکومت سکھ فوج کی تھی۔ جس سے اس کے سردار اور افسر اور امیر وزیر بلکہ مہاراجہ اور اُس کی والدہ بھی ڈرتے رہتے تھے۔

یہی وہ دن تھے۔ جب سکھ فوج نے انگریزوں سے لڑائی شروع کر دی۔ اور پے در پے ہر لڑائی میں شکست کھائی۔

انہی ایّام میں کپورتھلہ کی ریاست پر راجہ نہال سنگھ اہلووالیہ حکمران تھے۔ اور ان کی وزارت کا قلمدان کنج پورہ کے ایک مدبّر اور روشن خیال شخص مولوی غلام محمّد خاں غلامی کے سپرد تھا۔ سکھوں کی حمایت کی وجہ سے کپورتھلہ کی فوج بھی انگریزوں سے لڑنے کے لئے بیتاب ہو رہی تھی۔ لیکن وزیر ریاست جو بڑا دُور بین اور دُور اندیش اور اپنے آقا کا دلی خیرخواہ تھا۔ سکھوں کی خانہ جنگیاں اور خالصہ فوج کی مُنہ زوریاں

دیکھ دیکھ کر اپنے آقا سے عموماً کہتا رہتا تھا۔ کہ سکھ سلطنت اب چند روزہ مہمان نظر آ رہی ہے۔ لیکن جب سکھوں نے انگریزوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ تو اُس نے یقین کر لیا۔ کہ اب سکھ حکومت کے قائم رہنے کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی ہے۔ اُس نے راجہ نہال سنگھ کو ان لڑائیوں کے خوفناک نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ کہ نہ صرف سکھوں کی حکومت ہی اب تباہ ہوگی۔ بلکہ جو رئیس اِن کی حمایت کریگا۔ اس کے اقبال کا بھی خاتمہ سمجھنا چاہئے۔

جس طرح وزیر راجہ کا خیرخواہ تھا۔ اسی طرح راجہ کو بھی وزیر پر بڑا اعتبار تھا۔ اور وہ اس کی دانائی اور دُور اندیشی کی تعریف کیا کرتا تھا۔ چنانچہ وزیر کے مشورہ سے راجہ نے اُس زمانہ کے گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ اور سپہ سالار لارڈ گف کو لکھ دیا۔ کہ اُن کا اور اُن کی ریاست کا اس لڑائی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ وزیر نے اپنی فوج کی خودسری کے آثار دیکھ کر راجہ کو کپورتھلہ سے بھگا لے جانے کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ لیکن جب فوج کو خبر ہوئی۔ کہ وزیر کے بہکانے سے راجہ اس لڑائی میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔ بلکہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہے تو فوج نے جب کہ راجہ کی روانگی میں چند ہی منٹ

باقی تھے ۔ محل کو چاروں طرف سے گھیر کر توپیں لگا دیں۔ اور اندر جاکر بلند آواز سے کہنا شروع کیا ۔ کہ اس نمک حرام وزیر کو ہمارے سپرد کر دیجئے ۔ ورنہ ہم جلو خانہ (محل کا نام) کو ابھی توپ دم کئے دیتے ہیں۔ وزیر نے یہ سُن کر راجہ سے کہا ۔ کہ فوج کی پرخاشں میرے ساتھ ہے ۔ آپ کے ساتھ نہیں ۔ میں آپ کے لئے اور آپ کی ریاست کے بچاؤ کے لئے بلیدان ہوتا ہوں ۔ انگریز آج نہیں تو کل سارے پنجاب پر قابض ہو جائیں گے ۔ اس وقت میری یہ شہادت اور قربانی اس بات کا ثبوت ہوگی ۔ کہ آپ کی فوج زبردستی آپ کی مرضی کے بغیر سکھوں کی حمایت میں انگریزوں کے ساتھ لڑتی رہی ہے ۔ میرا قتل ہونا ہی آپ کی ریاست کے بقا کا باعث ہوگا +

راجہ نہال سنگھ اپنے وزیر کی خیر خواہیوں اور وفا داریوں اور ان کے نیک اور مفید مشوروں کی وجہ سے ان کا بڑا ادب اور لحاظ کرتے تھے ۔ اُنہوں نے جواب میں کہا ۔ کہ فوج کا رُکنا تو اب ہمارے اختیار سے باہر ہے ۔ لیکن میں آپ جیسے جان نثار وزیر کو جلادوں کے ہاتھوں میں دے دینے سے یہ بہتر سمجھتا ہوں ۔ کہ ریاست کو برباد اور اپنے آپ کو تباہ کر دوں۔ وزیر نے کہا ۔ جان نثار خادموں کی سعادت اور

نجات اسی میں ہے۔ کہ جب ضرورت آن پڑے۔ تو اپنے آقا کے لئے جان قربان کرنے کا ثبوت دیں وزیر یہ کہہ کر تن تنہا مفسدوں کے مقابلہ پر چلے گئے۔ اور چند ایک کو ہلاک کر کے خود بھی وہیں ڈھیر ہو گئے۔

دُور اندیش وزیر کا کہنا آخر صحیح ہو گیا۔ یعنی سکھوں کی کابل شکستوں کے بعد انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ اور جب گورنر جنرل کو یہ معلوم ہوا۔ کہ کپورتھلہ کی فوج اپنے راجہ کی مرضی کے بغیر شورش میں شامل ہوئی تھی۔ تو راجہ کے ساتھ اس کے روشن ضمیر وزیر کی موت پر افسوس کا اظہار کیا۔ اور راجہ کو جو اس وقت سرکاری طور پر سردار کہلاتا تھا۔ راجہ کا خطاب عطا کیا۔ اور اس کی ریاست کو برقرار رکھا +

"راجہ کو وزیر پر کس درجہ اعتماد تھا۔ اور وزیر نے راجہ اور اس کی ریاست کے لئے کس جوانمردی سے اپنی جان قربان کی فی الواقعہ جب طرفین اچھے ہوں۔ تو ایسا ہی نیک اور نمونہ کے قابل نتیجہ نکلا کرتا ہے +

انتہا درجہ کی نیکی

اکبر بادشاہ کے زمانے میں گنگا کے کنارے ایک

مہاتما جی بیٹھے بیٹھے خدا کی یاد کیا کرتے تھے - یہ مہاتما
بڑے نیک رحم دل دنیا پر لات مارنے والے۔غرضیکہ
حقیقت میں مہاتما تھے - ان کے پاس سامان تو کچھ زیادہ
تھا نہیں - بس وہی چند ضروری چیزیں آسن اور کچکول
وغیرہ جو سادھوؤں کے پاس ہوتی ہیں - ان کے پاس
بھی تھیں +

دنیا میں ہر قسم کے انسان بستے ہیں - اور دُنیا کی
مصیبتیں بعض اوقات انسان کو بڑے بڑے گناہ اور
بڑی بُری حرکتیں کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں +

ایک رات کا ذکر ہے - کہ ایسا ہی کوئی دنیا کا ستایا
ہوا شریف چور مہاتما جی کی جھونپڑی میں آیا - اور اُن
کا آسن وغیرہ اٹھا کر لے گیا +

صبح کو مہاتما جی نے جب اپنی جھونپڑی میں یہ چیزیں
نہ پائیں - تو چیخ چیخ کر رونے لگے - لوگوں کو بڑا تعجب
ہوا - کہ جو مہاتما دنیا کی اس قدر نعمتوں پر لات مار کر
تنہا زندگی بسر کرنے کا عادی ہو چکا ہے - وہ آسن اور
کچکول کے لئے اس قدر کیوں بے چین ہے +

آخر تعجب کرنے والوں میں سے ایک نے دریافت
کیا :- کہ مہاتما آپ کیوں روتے ہیں - آپ نے تو دنیا پر
لات مار دی ہے - یہ کچکول اور آسن سسرا کیا ہے - کمبخت
چور چُرا لے گیا - تو لے جانے دیجئے - ہم آپ کو اَور لا دینگے +

مہاتما جی نے بزرد بارانہ گردن ہلائی۔ اور کہنے لگے:-
بھائی تم سوال کرنے سے پہلے ہی معلوم کر لیتے۔ کہ میری داڑھی دھوپ میں سفید نہیں ہوئی ہے۔ اور میں بیوقوف نہیں ہوں۔ لو میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ کہ میں کیوں رو رہا ہوں۔ مجھے کچکول اور آسن جانے کا ہرگز غم نہیں ہے۔ بلکہ مجھے اس بات کا غم ہے اور میں اس لئے رو رہا ہوں۔ کہ میرے پاس یہ چیزیں کیوں تھیں۔ نہ یہ چیزیں میرے پاس ہوتیں۔ اور نہ میرے پاس چور آ کر انہیں چراتا۔ اور نہ وہ خدا کے نزدیک گنہگار اور لوگوں کی نظروں میں چور ٹھہرتا۔ اے کاش میرے پاس یہ چیزیں نہ ہوتیں +

سب لوگ مہاتما جی کی اس انتہا درجے کی نیکی کا حال سُن کر حیران ہو گئے۔ اور مہاتما کے ہاتھ پاؤں چُومنے لگے۔ اور پہلے سے زیادہ مہاتما کی عزت ہونے لگی +

اکبر بادشاہ کو بھی مہاتما کی اس نیکی کی خبر ہوئی۔ چنانچہ وہ بھی مہاتما جی کے درشن کرنے آیا۔ اور اُن کی بہت تعظیم و تکریم کی +

"انتہا درجے کی نیکی دنیا میں انتہا درجہ کی انسانیت ہے۔"

مہربان برٹ رکیس

گلوسسٹر انگلستان کے ایک قصبہ کا نام ہے۔ وہاں ایک صاحب رہتے تھے۔ جن کا نام برٹ رکیس تھا۔ یہ عام خاص سے بڑی ہمدردی رکھتے تھے۔ اور اکثر اپنے پڑوسیوں کی مدد بھی کیا کرتے تھے +

ایک دن اپنے گھر سے نکل کر اپنے پریس کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں انہوں نے دیکھا۔ کہ لڑکے آپس میں بُری طرح کھیل میں مصروف ہیں۔ وہ آپس میں کبھی لڑتے ہیں۔ کبھی ہنستے ہیں۔ اور کبھی اِدھر اُدھر بھاگتے ہیں +

برٹ صاحب کو یہ دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ اور انہوں نے ایک عورت سے جو اپنے مکان کے دروازے میں کھڑی تھی۔ دریافت کیا :-

"کیا ان بچوں کا روز یہی حال یہی رنگ رہتا ہے"؟

عورت :- ہاں برٹ صاحب۔ دن بھر شور و غل مچاتے رہتے ہیں۔ اور اتوار تو گویا ان کے لئے عید ہے۔ اتوار کے دن تو اسکیمیں بنا بنا کر کھیلتے ہیں۔ برٹ صاحب نے عورت کے الفاظ کو سُنا۔ گردن ہلائی۔ اور اپنے پریس میں چلے گئے +

پریس میں دن بھر انہوں نے کچھ کام نہ کیا۔ بلکہ کوئی خاص بات سوچتے رہے۔ اور شام کو محلہ میں آتے ہی ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ اور تمام قصبہ میں اعلان کر دیا۔ کہ لوگ اپنے بچوں کو میرے پاس پڑھنے کے لئے بھیجیں۔ چنانچہ سب سے پہلا "سنڈے سکول" ۱۷۸۰ء میں برٹ ریکیس نے گلوسسٹر میں قائم کیا +

تھوڑے دنوں ہی کے بعد گلوسسٹر میں تعلیم کا بے حد چرچا ہو گیا۔ اور گلوسسٹر ہی میں کیا تمام دنیا میں سنڈے سکول قائم ہو گئے۔ جن میں آج لاکھوں طالبعلم تعلیم پا رہے ہیں +

برٹ صاحب کی اس مہربانی اور نیکی پر ان کے قصبے والوں نے پہلے سے بھی زیادہ ان کی عزت کرنی شروع کر دی۔ برٹ صاحب نے بھی بڑی مستقل مزاجی سے سکول چلایا۔ اور برابر اپنی زندگی تک چلاتے رہے +

"جو کم ہمت لوگ یہ کہا کرتے ہیں۔ کہ بھائی اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہے؟ وہ اگر کچھ کرنا چاہیں۔ تو اُن کے لئے یہ مختصر سی کہانی ایک نمونہ ہے +

داروغۂ جیل کی حکمتِ عملی

امریکہ کی ایک ریاست میں ایک شخص جیل کا داروغہ تھا۔ اس کا نام کلارسے تھا۔ وہ بڑا بہادر اور تیز فہم آدمی تھا۔ اور ساتھ ہی سخت مزاج اور تند خو بھی تھا ؛

ایک دن وہ جیل خانے کے صحن میں کرسی پر بیٹھا ہوا کچھ پڑھ رہا تھا۔ کہ اُس نے اپنی پشت کی طرف کسی کے پاؤں کی آواز سُنی۔ وہ چونکا۔ اور جب اُس نے گردن پھیر کر دیکھا۔ تو اُسے ایک نہایت قوی موٹا تازہ جسیم قیدی ہاتھ میں ایک لوہے کی سلاخ لئے آتا ہوا دکھائی دیا۔ جیسے ہی مسٹر کلارسے کی نظر اس قیدی پر پڑی۔ اس نے نہایت غضبناک خون سے بھری ہوئی آنکھیں نکال کر کہا :۔

"کلارسے! چپکے بیٹھے رہنا۔ میں بھاگ رہا ہوں۔ اگر تم نے سانس بھی نکالی۔ تو میں تمہاری جان لینے میں ذرا بھی دیر نہ کرونگا ؛

مسٹر کلارسے ذرا بھی نہ گھبرایا۔ اس کے حواس جیسے قائم تھے۔ ویسے ہی قائم رہے۔ اور اس نے نہایت ہمدردانہ لہجہ میں کہا :۔

"ارے تم آج ہی جا رہے ہو - اور تمہاری رہائی کے کاغذات جو آج آئے ہیں - اُن کی رُو سے تمہیں کل رہا ہونا چاہئے ؛

قیدی نے نہایت غصّے سے مسٹر کلارے کی اس بات کو سُنا - اور بہت ہی جھنجھلا کر کہا :-

"کلارے تم کیا کہہ رہے ہو ؟

مسٹر کلارے ! کہہ کیا رہا ہوں - میرے دوست ! تمہارے لئے حکم آ گیا ہے - کہ تم کل رہا کر دیئے جاؤ - اور کاغذات میں تمہارے کیریکٹر کے متعلق بڑی تعریف درج ہے - اور لکھا ہے - کہ تم بڑے نیک اور اچھے آدمی ہو - جانے کو تم ابھی جا سکتے ہو - مگر یہ اچھا ہے - کہ کل جاؤ - کیونکہ اس حالت میں سرکار تمہارے لئے کوئی بُرا خیال قائم نہ کریگی - اور ہاں میں تمہیں وہ کاغذ ہی کیوں نہ دکھاؤں - جو میرے میز کے خانے میں رکھے ہوئے ہیں ؛

یہ کہہ کر مسٹر کلارے اپنی میز کی طرف بڑھا - اور میز کے خانے سے فوراً اپنا بھرا ہوا پستول نکال لایا ؛

پستول دیکھتے ہی قیدی کے ہاتھ سے آہنی سلاخ گر پڑی - اور وہ تھر تھر کانپنے لگا ؛

" واقعی اوسان قائم رکھنا سب سے اعلےٰ

درجے کی بہادری ہے۔ اگر مسٹر کلارے
ذرا بھی گھبراتا۔ تو قیدی بھاگ جاتا۔
اوسان کبھی ہاتھ سے نہ دو۔ اور ہر وقت
اپنے حواس درست رکھو +

بادشاہ اور خوشامدی

کنیوٹ انگلستان کا ایک بہت بڑا بادشاہ گذرا ہے
اُسے خوشامد سے بڑی نفرت تھی۔ وہ اس بات کو
بہت ناپسند کرتا تھا۔ کہ لوگ اس کی خوبیاں تو بیان
کریں۔ لیکن اس کے عیب ظاہر نہ کریں۔ وہ حقیقت
میں بہت ہی صحیح خیالات کا انسان تھا۔ لیکن وہ ان
لوگوں کا کرہی کیا سکتا تھا۔ جو روز اس کی عظمت و
جبروت کے قصیدے اس کے دربار میں آکر پڑھا کرتے
اور قدم قدم پر اس کی بڑائی کے نغمے گایا کرتے تھے
ان میں ایسے لوگ بھی تھے۔ جو اس کو خدائی کا مرتبہ
دے کر اپنا اَن داتا کہا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ یہ
دُنیا اور دُنیا میں جو کچھ ہے۔ وہ سب آپ ہی کے لئے
ہے۔ اور آپ ہی کے حکم سے سُورج دن کو نکلتا اور
شام کو غرُوب ہو جاتا ہے۔ اور تارے اور چاند اور زمین
اور آسمان سب آپ کے ماتحت ہیں +

جب وہ ایسے لوگوں سے بے حد پریشان ہو گیا اور اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ یہ ہرگز خوشامد سے باز نہ آئینگے اور قیامت تک یہی کہے جائیں گے۔ کہ" بادشاہ کا حکم ہوا اور پانی پر بھی اثر کرتا ہے۔ تو وہ سوچنے لگا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ آخر ایک دن وہ سمندر کے کنارے گیا۔ اور خوشامدیوں کو بھی ساتھ لے گیا +

جب کینوٹ سمندر کے کنارے جا کر کھڑا ہوا۔ تو پانی کی لہریں اس کے پاؤں پر چڑھ چڑھ کر اپنا بڑھتا ہوا جوش دکھانے لگیں۔ اور آخر اُن کی نگاہوں میں دنیا کے ایک بادشاہ کی عزّت بھی کیا ہو سکتی تھی۔ کیونکہ وہ تو بادشاہوں کے بادشاہ کے حکم سے مضطر و مضطرب تھیں +

کینوٹ نے کہا :۔

" اے لہرو میرے قدموں پر نہ آؤ۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔ تم ہٹ جاؤ" +

لہروں کو اس کے حکم کی کیا پروا تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ بادشاہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ کینوٹ نے کئی بار یہ الفاظ کہے۔ لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ چنانچہ اُس نے اُن خوشامدی درباریوں سے کہا :۔

" اگر تم سچے ہو۔ تو سمندر کی ان پُر شور موجوں سے

کہہ دو۔ کہ بادشاہ سلامت حکم دے رہے ہیں۔ تمہیں ہٹ جانا چاہئے ❖

کبوتر کے ان فقروں نے خوشامدیوں کی گردنیں جھکا دیں۔ اور سب کے سب شرم کے مارے پانی پانی ہو گئے ❖

دوسرے لوگوں کو جب یہ حال معلوم ہوا۔ تو انہوں نے بادشاہ کی عقلمندی کی بہت صحیح داد دی۔ اور واقعی بادشاہ نے جس پیرایہ میں اُن کی خوشامدانہ فطرت کو ذلیل کیا۔ اس سے بہتر کوئی مہذب پیرایہ ہو نہیں سکتا تھا ❖

"خوشامد دنیا میں پست اور کم درجے کے لوگوں کا کام ہے۔ کبھی سنجیدہ اور شریف آدمی اسے پسند نہیں کرتے۔ کبھی کسی کی بے جا خوشامد نہ کرو۔ کیونکہ خوشامد سے انسان ذلیل ہو جاتا ہے" ❖

ایک بہادر راجپوت رانی

راجہ جسونت سنگھ راجپوتانہ میں نہایت مشہور راجہ گذرا ہے۔ ایک دفعہ اُسے دشمنوں کے مقابلے میں شکست نصیب ہوئی۔ اور وہ بھاگ کر اپنے قلعہ کی طرف آگیا ❖

جسونت سنگھ کی رانی نے جب یہ سُنا۔ کہ وہ تین چار سو سواروں کے ساتھ میدان جنگ سے بھاگ کر اپنی جان بچا کر چلا آیا ہے۔ تو اُس بہادر رانی کی حمیت کا دریا جوش میں آگیا۔ اور اُسے سخت غصہ آیا۔ اُس نے اسی غصے میں لوگوں کو حکم دیا۔ کہ :-

"مغلوب اور بزدل آدمی کے لئے قلعہ کے دروازے بند کر دو۔ اور اُسے اندر نہ آنے دو۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ جو اپنے ناموس کو اپنی جان کی خاطر تباہ کر سکتا ہے"

دربار کے امیروں نے بہادر رانی کو سمجھایا۔ کہ دشمن راجہ کا تعاقب کر رہے ہیں۔ اگر انہوں نے راجہ کو گرفتار کر لیا۔ تو بڑے رنج کی بات ہو گی۔ اس پر رانی کو اور بھی طیش آیا۔ اور اُس نے امیروں سے نہایت سخت لہجے میں کہا :-

میدان جنگ سے بھاگ آنے والا اور ایک روشن خاندان کا نام بدنام کرنے والا بزدل ہرگز میرا شوہر نہیں ہو سکتا۔ اور نہ وہ میواڑ کے بہادر راجپوت رانا کا داماد ہے۔ وہ جو میدان جنگ سے بہادر راجپوتوں کی طرح کامیاب واپس نہیں آ سکتا۔ اور وہ جو بہادر راجپوتوں کی طرح جانباز نہیں ہے۔ میں ہرگز اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ اور کبھی اس کے لئے

قلعہ کے دروازے نہیں کھل سکتے +

میرا اصول یہ ہے۔ اور ہر بہادر انسان کا یہ اصول ہونا چاہیئے۔ کہ :-

"لڑائی میں فتح حاصل کرے۔ یا وہیں فناہ ہوجائے"

بہادر رانی کی حالت غصّہ میں ہر لمحہ متغیّر ہوتی جاتی تھی۔ وہ کبھی اپنی بدقسمتی اور کبھی اپنے خاوند کی بُزدلی پر روتی تھی۔ اور کبھی دیوانوں کی طرح کہتی۔ میرا خاوند ہرگز زندہ نہیں ہے۔ وہ تو میدانِ جنگ میں کام آچکا۔ تم مجھے دھوکا دیتے ہو"

جب آٹھ دس دن تک رانی کی یہ حالت رہی۔ تو ایک دن اُس کے دماغ کا فیصلہ مستقل ہو کر رہ گیا۔ اور اُس نے ارادہ کر لیا۔ کہ وہ ضرور اپنے خاوند کی بُزدلی کے رنج میں چتا میں جل کر جان دیدیگی +

چنانچہ اُس نے اپنے نوکروں کو چتا چُننے کا حکم دیا۔ اور وہ بہادر رانی جل کر خاک سیاہ ہونے کے لئے روانہ ہوگئی +

رانی جلنے کے لئے جارہی تھی۔ لیکن قلعہ میں کسی کو بھی اتنی ہمت نہ ہوتی تھی۔ کہ وہ اسے روک سکے آخر اُس کی بوڑھی ماں آئی۔ اُس نے اُسے گلے لگایا۔ اور رو رو کر کہنے لگی :-

"بیٹی! تیرا خاوند تو زندہ ہے۔ تو کیوں چتا میں جلنے

کو تیار ہے۔

رانی۔ نہیں میرا خاوند تو مرچکا +

رانی کی ماں۔ نہیں بیٹی! وہ باہر قلعے کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اور اس کے پاس سامانِ جنگ نہیں ہے۔ بیٹی پتی کو اندر آنے دے۔ اور اجازت دے۔ کہ وہ ایک ہفتے کے اندر لڑائی کا سامان کرکے پھر دشمن سے لڑنے کے لئے روانہ ہو جائے +

رانی کی ماں یہ کہتی جاتی تھی۔ اور روتی جاتی تھی۔ کیونکہ اُسے اپنی جوان بیٹی کی موت کا بڑا غم تھا +

رانی نے جب اپنی ماں کو اس درجہ غمگین اور روتا ہوا دیکھا۔ تو پاس ادب سے خاموش ہو کر چتا میں جلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پھر اپنے خاوند جسونت سنگھ کو کئی شرطوں کے ساتھ اس نے قلعہ کے اندر آنے کی اجازت دی +

جسونت سنگھ آیا۔ تو اُس نے اپنی رانی کی اس بہادری کی خود بھی تعریف کی۔ اور اس کی بڑی عزت کی +

"بچو! ایک بہادر عورت کی مثال تمہیں تعلیم دیتی ہے۔ کہ" دنیا میں فتح حاصل کرو۔ یا مر جاؤ"! مرجانا بھی بڑی بات ہے۔ اور فتح حاصل کرنی بھی۔ ان دو بڑی باتوں میں

سے مر جانے ہی کو پسند کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب کہ دنیا میں فتح بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ پس "دنیا پر فتح حاصل کرو۔ بہادرانہ زندگی یہی ہے"

عدل و انصاف کی لاجواب مثال

ساڑھے پانچ سو سال[له] کا ذکر ہے۔ کہ دکن گجرات کے ملک پر احمد شاہ بادشاہ کی حکومت تھی۔ یہ سلطان بڑا عادل نیک اور رحم دل تھا۔ اس کی نظر میں غریب امیر ہندو مسلمان کی کوئی تمیز نہ تھی۔ وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک اور انصاف کرتا تھا۔

اس کا ایک داماد تھا۔ جو اُسے نہایت عزیز تھا۔ اتفاق سے ایک غریب مزدور اس کے ہاتھ سے قتل ہو گیا۔ پہلے تو اس معاملہ کو اندر ہی اندر چھپایا گیا۔ لیکن آخر بادشاہ کو خبر ہو گئی۔ فرمایا میرے مذہب اور میرے قانون میں غریب امیر کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اس کو گرفتار کر کے باقاعدہ عدالت کے سپرد کرو۔

[له] ۸۰۰ھ کے آغاز کا زمانہ ہے۔

چنانچہ گرفتاری کے بعد عدالت میں باقاعدہ مقدمہ شروع ہوا۔ موقعہ کے گواہ گذرے۔ اور ثابت ہو گیا۔ کہ واقعی شہزادہ ہی قاتل ہے۔ قاضی نے مزدور کے وارثوں کو بلا کر سمجھایا۔ کہ قاتل بادشاہ کا داماد ہے۔ جرم اس پر ثابت ہے۔ اور بادشاہ جو منصف مزاج اور عادل ہے۔ ضرور اس کو پھانسی کی سزا دے دیگا۔ لیکن اس سے تمہارا عزیز جو قتل ہو چکا ہے۔ واپس تو نہ آسکیگا بلکہ بادشاہ کو جب کبھی اپنے داماد کے مارے جانے کا خیال آیا کرے گا۔ تو ممکن ہے۔ تمہارے لئے کسی اور مصیبت کا سامنا نہ ہو جائے۔ اس لئے بہتر یہ ہے۔ کہ تم کچھ معاوضہ لے لو۔ تم غریب آدمی ہو۔ یہ رقم تمہارے اور مقتول کے بال بچوں کے کام آئیگی ✦ یہ کہہ کر قاضی نے بائیس اشرفیوں پر مقتول کے وارثوں کو راضی کر کے راضی نامہ پر ان کے انگوٹھے ثبت کرا لئے۔ اور اپنی رائے کے ساتھ کہ مقتول کے وارثوں نے اپنی رضا و رغبت سے خون کے بدلے بائیس اشرفیاں لینی منظور کر لی ہیں۔ مسل آخری حکم کے لئے بادشاہ کے حضور میں روانہ کر دی ✦

بادشاہ نے مقدمہ کے کاغذات بڑے غور سے پڑھنے کے بعد فرمایا " فیصلہ بہت کمزور ہے۔ اس فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ خاندان شاہی کے لوگ رعیت

کے غریب اور کمزور آدمیوں کو جب چاہیں گے۔ بائیس اشرفیاں دے کر مار ڈالا کریں گے۔ اور شہزادوں کے لئے یہ رقم دے دینا بالکل معمولی بات ہے۔ اس لئے میں سیاست اور انصاف کی رُو سے اور اپنی غریب رعایا کے جان و مال کا محافظ ہونے کی وجہ سے اس فیصلہ کے خلاف ہوں۔

میں جانتا ہوں۔ کہ خاندان شاہی کو اور خود مجھے اور سب سے زیادہ میری عزیز بیٹی کو میرے ان الفاظ سے سخت صدمہ پونچے گا۔ لیکن میں اپنے خاندان یا اولاد کی خوشی کے لئے غریب رعایا کی جان کو اس قدر سستا نہیں سمجھتا۔

راضی نامہ اور فیصلہ میں ضرور رعایت سے کام لیا گیا ہے۔ اس لئے میں عدالت ماتحت کے فیصلہ کو منسوخ کرتا ہوں۔ اور حکم دیتا ہوں۔ کہ خون کا بدلہ خون سے لیا جائے۔ اور قاتل کو پھانسی دی جائے۔ اور عام لوگوں اور دولت مندوں اور بڑے آدمیوں اور خاندان شاہی کے ممبروں کی عبرت اور آگاہی کے لئے ایک دن رات قاتل کی لاش کو شہر کے وسط میں لٹکایا جائے۔

"جب خدا کسی قوم میں ہمدردی، عدل اور انصاف کے ایسے ہی جوہر دیکھتا ہے۔ تو

اس کو حکومت بھی عطا کر دیتا ہے۔ اور جب ان اوصاف سے کوئی قوم محروم ہو جاتی ہے۔ تو اس سے سلطنت بھی چھین لی جاتی ہے۔"

یاد رکھو۔ کسی غریب کے خون کی بھی اتنی ہی قیمت ہے۔ جس قدر کسی بادشاہ یا شہزادے یا کسی بڑے آدمی کے خون کی۔

وطن کی محبّت

قریباً سو سال کا عرصہ گذرا ہوگا۔ آسٹریلیا میں انگلستان کی ایک عورت "ڈیکر" تھی۔ اس کو اپنے وطن سے اس قدر محبّت تھی۔ کہ وہ اپنی ضروریات زندگی کی ہر چیز اپنے وطن ہی سے منگوایا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے کفن کا کپڑا بھی انگلستان ہی سے منگوا رکھا تھا۔

آسٹریلیا میں جب اس کا انتقال ہو گیا۔ تو اس کے ایک دوست نے ایک تھیلی میں سے کچھ مٹی اس کے کفن کے اندر رکھ دی۔

وہ لوگ جو ڈیکر کے جنازے کے ساتھ شریک تھے۔ اس حرکت پر حیران رہ گئے۔ بعض نے تو یہ خیال کر لیا۔ کہ یہ مٹی جو ڈیکر کے کفن میں اس کے دوست نے

رکھی ہے۔ اس کا سبب کوئی مذہبی یا اخلاقی رسم ہے۔
ایک دن ڈیکر کا وہی دوست جس نے اس کے کفن
میں مٹی رکھی تھی۔ ایک مجمع میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ ڈیکر کا
ذکر آ گیا۔ بعض لوگ اس کی موت اور بعض اس کے
اخلاق کو یاد کر کے اظہار افسوس کرنے لگے۔ لیکن اس
مجمع میں سے ایک نے کہا:۔
"کیوں جی! یہ ڈیکر کے کفن میں مٹی کیسی رکھی گئی تھی؟
یہ تو بالکل نئی بات تھی۔ ایسا تو ہم نے کہیں دیکھا نہیں +
کسی نے کچھ جواب دیا۔ کسی نے کچھ۔ لیکن ڈیکر کے
دوست نے کہا:۔ سنئے! ڈیکر ایک نیک دل عورت تھی
جس کے نازک دل میں اپنے وطن کی محبّت کے اثرات
کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ وہ مٹی جو میں نے
اُس کے کفن میں رکھی۔ وہ در اصل سرزمین انگلستان
کی مٹی تھی۔ جو وہاں سے لائی گئی تھی +
ڈیکر کی بڑی آرزو تھی۔ کہ اس کے کفن پر اس کے
وطن کی مٹی بکھیری جائے۔ تاکہ اس کی رُوح مطمئن
رہے۔ اور سمجھتی رہے۔ کہ وہ کسی غیر ملک کی سرزمین
میں دفن نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس کا جسم اس کے وطن
کی مٹی کے سپرد کیا گیا ہے +
جب لوگوں نے ڈیکر کے دوست سے ڈیکر کی حب الوطنی
کی کیفیت سُنی۔ تو ان سب نے کھڑے ہو کر اس کے

لئے دعا مانگی +

"ڈیکمہ کی طرح تم بھی وطن سے محبّت کرنے کی کوشش کرو۔ اور وطن کو اپنی محبّت سے خوشحال وطن بنا دو" +

ایک لڑکی کی ذہانت

جرمنی کا بادشاہ ایک دفعہ اپنی سلطنت میں سیر کرتے کرتے ایک گاؤں میں پونچا۔ بادشاہ کے استقبال کے لئے اس گاؤں کے لوگ آئے۔ اور سکول کے تمام چھوٹے بڑے لڑکے اور لڑکیوں نے ایک خاص مقررہ جگہ کھڑے ہو کر سلامتی کے گیت کے بعد اپنا اپنا سبق سنایا +

بادشاہ تھوڑی دیر تک تو لڑکوں اور لڑکیوں کا امتحان لیتا رہا۔ آخر میں اس نے اپنے ہاتھ میں ایک خوبصورت نارنگی لی۔ اور ایک لڑکی کو پاس بلا کر اُس سے پُوچھا +

"یہ چیز کائنات کی کون سی قسم میں سے ہے"!

لڑکی۔ بادشاہ سلامت! یہ تو نباتات کی قِسم سے ہے +

بادشاہ نے نارنگی کو تو رکھ دیا۔ اور اپنی جیب سے ایک اشرفی نکال کر لڑکی سے پوچھنے لگا۔ اور پیاری بچّی!

یہ کس قسم سے ہے؟
لڑکی۔ یہ جمادات سے +
بادشاہ نے کہا۔ اچھا یہ بتاؤ۔ کہ مَیں کائنات کی کونسی قسم سے ہوں۔ بادشاہ کے اس سوال پر لڑکی ذرا گھبرائی۔ کیونکہ اسے یہ تو معلوم تھا۔ کہ خدا کی کائنات نباتات جمادات اور حیوانات پر قائم ہے۔ اور اگر وہ کہنا چاہتی۔ تو کہہ سکتی تھی۔ کہ آپ حیوانات کی قسم سے ہیں۔ لیکن وہ بادشاہ سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اور اگر کہتی بھی تو گستاخی ہوتی۔ اور وہ اس گستاخی سے بچ کر سوال کا جواب دینا چاہتی تھی +
مگر وہ سنبھلی۔ اور اُس نے کہا۔ حضور! آپ تو خدا کی بادشاہت میں شامل ہیں +
بادشاہ یہ سُن کر بہت متاثر ہوا۔ اور لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔ تم بڑی ذہین ہو تم بڑی ذہین ہو۔ اے کاش جیسا تم نے کہا۔ میں خدا کی بادشاہت میں شامل ہونے کے قابل ہو جاؤں +

"ذہانت خدا کی ایک نعمت ہے۔ جو دنیا میں فطری طور پر بہت کم انسانوں کو ملتی ہے"

مُنہ دیکھے کی عبادت

مُنہ دیکھے کی محبّت تو تم نے بہت سُنی ہوگی۔ لیکن فینی لان نے "منہ دیکھے کی عبادت" کو جس طرح ثابت کیا۔ وہ بڑی تعجّب خیز ہے +

فینی لان فرانس کے بادشاہ شاہ لوئی کے پاس رہا کرتا تھا۔ شاہ لوئی سے اُسے بڑی ہمدردی تھی۔ اور بادشاہ بھی اُسے نہایت عزّت کی نگاہ سے دیکھتا تھا

ایک دفعہ فینی نے بادشاہ کے خوشامدیوں کی حقیقت کھولنے کی کیا ترکیب کی۔ کہ اُس نے تمام لوگوں سے کہدیا۔ آج بادشاہ گرجے نہیں جائیگا۔ وہ تمام لوگ جو بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے یا اُس کے ڈر سے گرجے جاتے تھے۔ خوش ہو گئے۔ اور خدا کا شکر ادا کرنے لگے کہ "جان بچی لاکھوں پائے"۔ لیکن فینی بادشاہ کو خفیہ راستے سے لے کر گرجے پونچ گیا +

جب بادشاہ گرجے پونچا۔ تو وہاں کوئی نہ تھا۔ پادری، فینی اور ایک خدمتگار دیکھ کر وہ حیران سا ہوا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ فینی بادشاہ کو حیران دیکھ کر زور سے بولا۔

"حضور میں نے کل شہر میں مشہور کر دیا

تھا۔کہ بادشاہ سلامت گرجے نہیں جائینگے
اس سے میرا مقصد یہ تھا۔کہ میں اُن خوشامدیوں
کی حقیقت کھول دوں جو "عبادت بھی منہ
دیکھے" کی کرتے ہیں۔"

آج حضور کو معلوم ہوا۔کہ سچّی عبادت کرنے والے
کتنے ہیں؟ اور مُنہ دیکھی عبادت کرنے والے خوشامدی
کتنے!

بادشاہ فلپی کی اس حیرت انگیز دانش مندی
پر بہت خوش ہوا اور اس کی زیادہ عزت کرنے
لگا۔ اور خوشامدی امیر اُس کی نگاہوں سے گر
گئے۔

"منہ دیکھے کی محبّت یا منہ دیکھے کی عبادت
خوشامد ہی کے الگ الگ دو مہذّب نام
ہیں۔جس طرح خوشامد بُری ہے۔ اسی طرح
یہ دونوں باتیں بھی لغو ہیں"۔

"بہادرانہ سچ البتہ انسانی شرافت ہے"۔

ہماری مطبوعات اور تعلیمی محکمے

ہماری مطبوعات جو قریباً سب کی سب پنجاب و کشمیر کے مشہور مصنف و مؤرخ منشی محمد الدین فوقؔ ایڈیٹر اخبار کشمیری لاہور کی تصنیفات سے ہیں۔ پبلک کے علاوہ ہندوستان کے مختلف صوبجات اور دیسی ریاستوں کے محکمہ ہائے تعلیم میں بھی قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ منجملہ ان کے مندرجہ حاشیہ کتب نمبر ایک سے نمبر دس تک گورنمنٹ جموں و کشمیر کے سررشتہ تعلیم میں بطور انعامی لائبریری

(۱) حکمت کے موتی ۴ر
(۲) روایاتِ اسلام ۶ر
(۳) سوانح مولانا غنی ۶ر
(۴) مشاہیر کشمیر ۸ر
(۵) مکمل تاریخ کشمیر ۳ ۱ر
(۶) کشمیر کی رانیاں ۴ر
(۷) تاریخ کا روشن پہلو ۱۲ر
(۸) سکاؤٹوں کے گیت ۲ر
(۹) شباب کشمیر ۱۲ر
(۱۰) حکایات کشمیر ۶ر
(۱۱) تاریخ حریت اسلام ۱۲ر
(۱۲) جغرافیہ پونچھ ۳ر

کتب منظور ہیں۔ نمبر ا نمبر ۵ نمبر ۶ نمبر ۷ نمبر ۹ ریاست پونچھ اور نمبر ۹ ریاستہائے ٹونک و کپورتھلہ کے سررشتہ تعلیم میں اور نمبر ۸ محکمہ تعلیم صوبہ متوسط (سی۔ پی) اور نمبر ۱ ٹیکسٹ بک کمیٹی مدارس پنجاب اور ریاستہائے بہاولپور بھوپال نے اپنے مدارس کیلئے بطور انعام و لائبریری کتب منظور کی ہوئی ہے۔ یہ سب کتابیں دو دو تین تین بلکہ چھ چھ مرتبہ چھپ چکی ہیں۔ کتاب نمبر ۱ سررشتہ تعلیم جموں و کشمیر کی جماعت ششم اور محکمہ تعلیم پونچھ کی جماعت پنجم اور کتاب نمبر ۷ سررشتہ تعلیم ریاست مالیر کوٹلہ کی جماعت ہشتم کے لئے بطور سپلیمنٹری ریڈر منظور ہے۔ اور کتاب نمبر ۱۲ محکمہ تعلیم پونچھ نے جماعت سوم پرائمری کے لئے کورس مقرر کی ہوئی ہے۔

ہمیں امید ہے۔ کہ محکمہ تعلیم پنجاب اور ریاستوں کے صاحبان انسپکٹر مدارس انکے اسسٹنٹ اور ہیڈ ماسٹر صاحبان مدارس ہماری مقبول عام کتابوں کی طرف خاص طور پر توجہ فرما کر ہماری سرپرستی فرمائینگے

کتاب نمبر ۲ محکمہ تعلیم یو۔ پی میں بھی بطور لائبریری و انعامی منظور ہے۔

المشتہران

ظفر برادرس تاجران کتب ظفر منزل لاہور

منشی محمد الدین فوقؔ پبلشر نے حمایت اسلام پریس لاہور میں باہتمام شیخ حسن الدین سپرنٹنڈنٹ چھپوا کر ظفر منزل لاہور سے شائع کی

تاریخ حریت اسلام

مصنفہ منشی محمد الدین صاحب فوق

بارہ سو صفحوں سے زائد حجم کی کتاب کا ایک سال میں دو مرتبہ چھپ جانا معمولی بات نہیں ہے
یہ وہی تاریخ ہے جس کو بھوپال و بہاولپور کی ریاستوں میں لائبریریوں کے لئے خریدا گیا
ہے اور جس کو صاحب ڈائریکٹر رشتہ تعلیم پنجاب نے صوبہ پنجاب کے سکولوں کی لائبریریوں
اور انعامی کتب کیلئے پسند فرمایا ہے۔ اس تاریخ پر جو حقیقتاً تمام دنیا کی اسلامی حکومتوں
کے روشن پہلو کی ایک چمکتی ہوئی تصویر ہے ابتک اس قدر رائیں لکھی جا چکی ہیں کہ شاید
بہت کم کتابوں کو نصیب ہوئی ہونگی۔ اس کتاب میں زمانہ رسالت عہد خلافت خلفائے
بنی امیہ و عباسیہ۔ عہد بنی بویہ و سلجوقیہ۔ دولت ہسپانیہ و غزنویہ کے علاوہ۔ ٹرکی مصر
الجزائر۔ مراکش اور فرمانروایان ہند۔ خاندان افاغنہ۔ غلامان و عہد مغلیہ وغیرہ اور
مسلمان بادشاہان دکن۔ سندھ۔ گجرات کشمیر کے عہدہائے زریں کے راست باز حق گو
حق پرست بزرگوں کے حیرت خیز جرأت آفرین۔ ولولہ انگیز۔ استقلال اور جوش و
رگ حریت آموز حالات اور عدل و انصاف مساوات۔ خداترسی و پاکیزہ نفسی کے حامی
بادشاہوں کے سبق آموز واقعات کے علاوہ پرستاران حق و صداقت اور فدائے ملت و
بہادر عورتوں کے سوانحات عمر درج ہیں۔ اس تاریخ کو جو دراصل احرار اسلام کا ایک پرجوش
تذکرہ ہے۔ ملک کے تمام برگزیدہ اصحاب نے اسلامی لٹریچر میں ایک بہترین اضافہ تسلیم کیا
ہے۔ قیمت تین روپے (سے) مجلد (ہے) معہ خرچ ڈاک (ہے)

ملنے کا پتہ۔ ظفر برادرس تاجران کتب ظفر منزل لاہور

ہماری مطبوعات اور محکمہ تعلیم جموں و کشمیر

ترجمہ چٹھی نمبر ۱۹۰ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۲۹ء من جانب صاحب سکرٹری ہوم منسٹر

(ایجوکیشنل برانچ) گورنمنٹ جموں و کشمیر

بحوالہ آپ کی چٹھی مورخہ ۲ جنوری ۱۹۲۹ء میں آپ کو دفتر ہذا کی چٹھی نمبر ۱۲۱۵ مورخہ ۱۲ جنوری ۱۹۲۹ء کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ کہ آپ کی مندرجہ حاشیہ کتب پہلے ہی سے سکولوں کی لائبریریوں اور تقسیم انعامات کے لئے منظور ہو چکی ہیں فہرست ہذا میں آپ کی کتاب "حکایات کشمیر" کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ وہ اب موصول ہوئی ہے۔ اور اس پر غور کیا جا رہا ہے۔

(۱) حکمت کے موتی
(۲) روایات اسلام
(۳) سوانح عمری مولانا غنی
(۴) مشاہیر کشمیر
(۵) مکمل تاریخ کشمیر
(۶) کشمیر کی رانیاں

ہمیں امید ہے۔ گورنمنٹ جموں و کشمیر کے صاحبان انسپکٹران مدارس اور ان کے اسسٹنٹ صاحبان اور ہائی مڈل اور پرائمری سکولز کے ہیڈ ماسٹر صاحبان ہماری مقبول عام کتابوں کی طرف جو طلبائے کشمیر کے لئے نہایت مفید ہیں۔ خاص توجہ فرما کر ہماری سرپرستی فرمائیں گے۔

الملتمس

میسرز ظفر برادرس پبلشرز و بک سیلرس ظفر منزل لاہور

(صرف سرورق مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس لاہور)

ظفر برادرس تاجران کتب ظفر منزل لاہور کا سلسلہ تالیفات ۵

اہل کشمیر کی ذہنی و دماغی قابلیتوں کا نچوڑ

وادی کشمیر کے تاریخی خزانوں سے

حکمت کے موتی

وہ اقوال اور شلوک مع تشریحات کاملہ جن میں ایسی ایسی ہدایات و نصائح درج ہیں۔ جو رعایا سے لیکر راجہ اور امیر سے لیکر غریب تک کیلئے یکساں مفید ہوسکتی ہیں۔ یہ تمام سبق آموز اقوال۔ عبرت انگیز شلوک اور معنی خیز نکتے سنسکرت زبان کی نہایت مشہور اور مستند تاریخ **راج ترنگنی** کے ترجمہ سے اخذ کئے گئے ہیں۔ دیباچہ میں کشمیر ملک ہندوستان کے قدیم سنسکرت شاعر و مورخ پنڈت کلہن مصنف راج ترنگنی کے حالات بھی درج ہیں۔

مرتبہ

محمد الدین فوق

۱۹۳۲ء مطابق ۱۳۵۱ھ ہجری موافق سمت ۱۹۸۹ ب

قیمت فی جلد ۱۲ر

تعداد جلد ایک ہزار

پنڈت کلہن مصنفؒ راج ترنگنی

کے مختصر حالاتِ زندگی

راج ترنگنی بجائے خود ایک ایسی لاجواب قدیم تاریخ ہے۔ جو کلہن کے نام کو بغیر کسی حسب نسب اور بغیر کسی خاص امتیاز کے قیامت تک زندہ اور برقرار رکھ سکتی ہے لیکن پنڈت کلہن کے سوانحی حالات اس کی شخصیت اور اس کے ذاتی کارناموں پر ایسا تاریک پردہ پڑا ہوا ہے۔ کہ قیاسی آفتاب کی فلسفیانہ شعاعیں بھی بمشکل اس پر روشنی ڈال سکتی ہیں۔ تاہم سٹائین صاحب نے جنہوں نے راج ترنگنی کو انگریزی لباس پہنایا ہے۔ راج ترنگنی ہی کے متفرق شلوکوں سے قیاس اور خیال کی مدد سے اس کے حالات بہم پہنچائے ہیں۔ اور وہی حالات اب اس کی زندگی کے عام خاکہ کے طور پر بطور اختصار پیش کئے جاتے ہیں مفصل حالات دیکھنے ہوں تو ٹھاکر اچھر چند کی مترجمہ و مؤلفہ کتاب راج ترنگنی کا مطالعہ کیجیئے۔ جو سٹائین صاحب کے انگریزی ترجمہ سے اردو کے قالب میں ڈھالی گئی ہے۔

کلہن کا باپ کلہن نے اپنی تاریخ میں آٹھ ترنگ مقرر کئے ہیں ہر ترنگ کا خاتمہ مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ کیا

جاتا ہے "یہاں راج ترنگنی کی پہلی و دوسری یا تیسری الخ ترنگ ختم ہوتی
ہے جسے کشمیر کے مشہور چمپک کے بیٹے کلہن نے تصنیف کیا ہے" ان
الفاظ سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کلہن جس طرح غیر معمولی ذہانت
و ذکاوت اور خصوصاً فن تاریخ نویسی میں مہارت رکھتا تھا۔ ایسا ہی
وہ خاندان کی طرف سے بھی معمولی آدمی نہیں تھا۔ چمپک کا ذکر
راج ترنگنی میں سب سے پہلے راجہ ہرش کی حکومت کے آخری دنوں
میں آیا ہے جبکہ اس نے ۱۰۹۸ء کے آخر میں راجہ کے حکم سے دردوں
کے سرحدی مقامات کی کمان ہاتھ میں لی تھی۔ اور باوجود دوسرے
افسروں کی سازش اور نمکحرامی کے وہ قلعہ وگدہ گھاٹ کا محاصرہ
کرنے میں پورے پر کامیاب ہوگیا تھا۔ جب راجہ ہرش نہ صرف
تخت و تاج ہی سے مایوس ہو رہا تھا۔ بلکہ اس کو جان کے لالے بھی
پڑ رہے تھے۔ ایسے نازک وقت میں چمپک وزیر ہی اس کا وفادار
ہمراہی تھا۔ چمپک کی موت کب واقع ہوئی۔ اس کے متعلق کوئی ٹھیک
علم نہیں لیکن راج ترنگنی کے ترنگ نمبر ۸ شلوک ۲۳۶۵ سے اسقدر معلوم
ہوتا ہے کہ ۱۱۳۰ء کے قریب قریب وہ زندہ تھا۔ جب ہم اس کو
۱۰۹۸ء کے آخر یا ۱۰۹۹ء کے شروع میں ایک کمان افسر کی حیثیت
سے دیکھتے ہیں۔ تو اس کی عمر کا اندازہ اقل درجہ بھی اگر لگایا جائے۔ تو
۲۵-۲۶ سال سے کیا کم ہوگا۔ دوسری طرف ۱۱۴۱ء تک اس کے
زندہ رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس حساب سے اس کی پیدائش ۱۰۷۲ء

یا ایک یا دو سال کم و بیش سے لیکر ۱۱۳۶ء تک جب تک اسکی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔اس کی عمر قریباً ۴۶ سال تک پائی جاتی ہے۔اور اس عمر کے صحیح ہونے کا ایک یہ بھی ثبوت ہے کہ وہ زمانہ میں تیرتھوں کی یاترا میں اکثر مصروف رہتا تھا۔ یہ ظاہر کرنے کی شائد ضرورت نہیں ہے کہ عمر کے آخری حصہ ہی میں عموماً پوجا پاٹ۔نماز روزہ۔تیرتھوں کی یاترا اور حج وغیرہ کا شوق دامنگیر ہوتا ہے۔

کلہن کی پیدائش کلہن کی تصنیف کا اندازہ ۱۱۴۸ء یا ۱۱۴۹ء میں کیا جاتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب اس نے کتاب لکھی ہے۔تو وہ جوانی کی منزلیں طے کرکے شیخوخیت کے کوچہ میں قدم رکھ رہا تھا۔سرینگر میں ۱۱۲۱ء کے موسم بہار کے بعض واقعات جو راجہ سسیل کے عہد میں ہوئے۔اس طرح سے اس نے بیان کئے ہیں کہ گویا وہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے ہوئے ہیں اور ان واقعات کی نسبت جو آرا ظاہر کی گئی ہیں۔وہ معلوم ہوتا ہے۔کہ کسی پختہ کار شخص کے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہیں۔۱۰۹۰ء میں کلہن کا باپ ایک معزز فوجی عہدہ (کمان افسری) پر متعین تھا۔جبکہ اس کی عمر اندازاً ۲۵-۲۶ سال کی تھی۔ ممکن ہے کلہن انہی دنوں میں چمپک کا پہلوٹھا بیٹا ہو۔اس حساب سے یہ امر شائد زیادہ خلاف واقعہ نہ ہوگا اگر کلہن کی پیدائش کا سال ۱۰۹۷ء یا ۱۰۹۸ء قائم کر لیا جائے۔اس حساب سے اس کی عمر راجہ سسل کے زمانہ میں ۲۴ یا ۲۵ سال اور کتاب کی تصنیف کے وقت ۵۰ سے اوپر سمجھنی چاہیئے

کلہن کا وطن کلہن کا وطن دراصل کشمیر تھا لیکن کشمیر چونکہ ایک ملک ہے جس طرح پنجاب۔سندھ۔دکن وغیرہ اسی لئے مورخوں کو اس کا اصل وطن جہاں اس کے آبا و اجداد رہتے تھے۔تلاش کرنے میں بڑی دقت کا سامنا رہا ہے۔اور منزل پر اگر تھوڑی سی رسائی بھی ہوئی ہے۔تو وہ بھی قیاسی گھوڑوں کی بدولت۔ورنہ کسی تحریر سے کوئی صحیح نتیجہ اس کے حالات و وطن کا مترتب نہیں ہوتا ترنگ نمبر۷ میں کلہن کے ایک اور رشتہ دار کنک نامی کا ذکر ہے جس نے راگ ودیا کے ذریعہ راجہ ہرش سے ایک لاکھ طلائی سکے حاصل کئے تھے۔کنک کو چمپک کا چھوٹا بھائی ظاہر کیا گیا ہے اور اس رعایت سے وہ رشتہ میں کلہن کا چچا ہے۔کنک کے متعلق لکھا ہے کہ وہ پرہاس پور میں پیدا ہوا تھا۔ان سطور سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ کلہن کے خاندان کا وطن دراصل یہی مقام پرہاس پور ہے۔اور اس کی وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اس نے اپنی تصنیف میں اس مقام کی مقدس عمارات اور اسکی جغرافیائی حالت کو اس تفصیل اور واقفیت سے بیان کیا ہے۔جو اس کے خاص وطن یا پیدائشی مقام ہونے کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔

کلہن کا مذہب کلہن کشمیری النسل اور ذات کے لحاظ سے برہمن تھا اس زمانہ سے بہت مدت پہلے کشمیر میں بدھ مذہب کا زور رہا ہے۔بلکہ اس کو وشنو کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔کلہن سے ایک صدی پیشتر ایک اور نامی کشمیری مصنف کشیندر نے اپنی تصنیف

دش اوتار چرت" میں ساکی منی یا گوتم بدھ کے مکمل و مفصل حالات درج کئے ہیں۔ ان کے علاوہ کشمیریوں کی مشہور قابل عزت کتاب "نیل مت پوران" میں بدھ کی سالگرہ کو ایک عظیم تہوار قرار دیا گیا ہے راجہ ہرش کے زمانہ (۱۰۸۹ء تا ۱۱۰۱ء) میں بودھوں، جینیوں اور برہمنوں کا زور تھا۔ کلہن کا باپ شیوجی کا پجاری تھا۔ کلہن کا چچا بدھ مت کے طریق عبادت سے تعلق رکھتا تھا۔ کلہن مذہبًا تو باپ کا پیرو تھا۔ چنانچہ وہ ہر ترنگ کو شیوجی اور پاربتی کے نام سے شروع کرتا ہے۔ اور ان کی طاقتوں کو آسمانی طاقت اور عام کشمیری پنڈتوں کی طرح ان کو تمام عالم پر حاوی سمجھتا ہے۔ لیکن اس نے اپنی کتاب میں اکثر مقامات پر بدھ مت کا ذکر نہایت تعریفی الفاظ اور بدھ کا نام نہایت ادب واحترام سے لیا ہے۔

کلہن کا علمی مطالعہ اور اس کی شاعری

کلہن سنسکرت زبان کا فاضل اجل اور متبحر عالم تھا۔ وہ اپنے زمانہ کے صرف نحو اور علم فصاحت و بلاغت پر کامل عبور رکھتا تھا۔ سیاسی معاملات پر اسے پوری دسترس تھی۔ وہ کشمیری ذکاوت و ذہانت کا ایک زندہ نمونہ تھا۔ وکرمانک[۱] دیو چرت اور ہرش[۲] چرت کے علاوہ

---

[۱] سنسکرت کی ایک تاریخی منظوم کتاب جو بلہن کشمیری نے ۱۰۸۵ء کے قریب تصنیف کی تھی [۲] راجہ ہرش وردھن والئے قنوج و تھانیسر کے درباری شاعر بان کی سنسکرت تصنیف جو ایک تاریخی منظوم واقعہ ہے۔

رامائن اور مہابھارت اور دیگر رزمیہ شاعرانہ لٹریچر کے مطالعہ سے اس نے اپنی نثر کو جادو اثر اور شاعری کو سحر نگاری کا مترادف بنا لیا تھا جس شخص کو زبان سنسکرت پر عبور کامل ہو اور جو پیچیدہ بلاغت اور شاعرانہ باریکیوں سے آگاہ ہو وہ یہ جاننے کی قابلیت رکھ سکتا ہے کہ کلہن کا مرتبہ شاعری میں کس پایہ کا تھا۔ ہندوستان میں کسی زمانہ میں نظم کا درجہ اس قدر بلند تھا۔ اور اس کی ہر دلعزیزی یہاں تک بڑھی ہوئی تھی۔ کہ عام قصے کہانیوں کے علاوہ ملک کی تاریخ اور سیاسی واقعات کو بھی شاعری ہی کے ذریعہ ادا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ مہابھارت اور رامائن اس کی زندہ نظیر موجود ہیں۔ اور فردوسی کا شاہنامہ اس کی چمکتی ہوئی شہادت ہے کلہن کے زمانہ میں رزمیہ نظموں کا بڑا رواج تھا اسلئے اس نے اپنی قابلیت اور دماغ سوزی کے جوہر نظم کے میدان ہی میں دکھلانے پسند کئے۔ کلہن کی شاعری کے متعلق اس کا ایک ہم وطن شاعر سریکنٹھ چرت میں ایک جگہ لکھتا ہے۔ کہ کلہن شاعران لوگوں میں جو نظم لکھنے کی اعلےٰ قابلیت رکھتے ہیں۔ امتیاز خاص رکھتا ہے۔ ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ اس کی نظم ایسی مجلا و مصفا ہے کہ جس طرح شیشہ میں عکس آجاتا ہے ایسے ہی اس نے بلہن شاعر کی قابلیت اپنے آئینہ دل پر منعکس کرلی ہے۔

کلہن یا کلیان سنکھ نے اپنی کتاب سریکنٹھ چرت میں جہاں کلہن کا ذکر کیا ہے وہاں بجائے کلہن کے اس کا نام کلیان لکھا ہے۔ اور سٹائین صاحب اور دیگر مورخوں کا بیان ہے کہ یہی نام دراصل

درست ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ کلیان حقیقت میں سنسکرت زبان کا
لفظ ہے۔ اس کے معنی عام فہم ہیں اور لفظ کلہن کلیان سے بگڑا ہوا ہے
کشمیر اور ہندوستان میں لوگوں کے نام بگاڑنے کا عام رواج ہے اور
ممکن ہے کہ کلہن کی اصل وجہ بھی اسی طرح ہو اور یہ لفظ یہاں تک شہرت پذیر
ہو چکا ہو کہ کلیان نے بھی اپنا نام کلہن ہی رکھا اور لکھا پسند کیا ہو کلہن کی
اپنی تصنیف راج ترنگنی میں بھی بعض تذکرے مختلف ناموں سے پائے جاتے
ہیں مثلاً گرگ چند کو بعض جگہ گنگ چند اور پوشٹھک کو بعض جگہ پوتھک لکھا ہے

کلہن کے زمانہ میں کشمیر کی پولیٹیکل حالت کیا تھی؟

کلہن کے یوم پیدائش ۱۰۹۷-۹۸ء سے لیکر
اس کی وفات تک کشمیر کے تخت و تاج کو
سات انقلاب دیکھنے پڑے تھے۔ اسکی
پیدائش کے دنوں میں راجہ ہرش کے ہاتھ میں حکومت کی باگ تھی ابتدا
میں اس کی حکومت ترقی امن و امان اور خوشحالی کا باعث تھی لیکن بعد میں
جب نالائق درباریوں کی وجہ سے وہ عیاشانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ تو
ملک میں بغاوت کا زور ہو گیا اور آخر شاہی نسل کے دو شہزادوں اوچل
اور سسل نے اس کو قتل کرنے کے بعد تخت اس سے چھین لیا لیکن اہل
کشمیر کی قسمت میں ابھی اور بہت سے مصائب دیکھنے لکھے تھے اسلئے دونوں
بھائیوں میں تخت کشمیر کے لئے خطرناک جنگ شروع ہوئی۔ جو ایک سال
تک برابر جاری رہی اور اس وقت تک ختم نہ ہوئی جب تک سسل نے
اپنے بھائی اوچل کو اسکی کے معتبر دیگر نمکحرام) اہل کاروں کی معرفت

قتل نہ کرا لیا۔ سازش کنندوں میں ایک ہوشیار اور چالاک شخص رو نامی تھا جس نے اپنی حکمت عملیوں سے تخت پر قبضہ کر لیا۔ مگر صرف ایک ہی دن (۸ یا ۹ دسمبر ۱۱۱۱ء) حکومت کرنے پایا تھا کہ گرگ چندر ولسانئے لہرنے جو ان دنوں حقیقی بادشاہ گری کے فرائض بجا لا رہا تھا اوچل کے ایک سوتیلے بھائی سلہن کے سر پر تاج پہنا دیا۔ سلہن نے چونکہ گرگ چندر کی وساطت سے تخت حاصل کیا تھا اس لئے وہ ایک عضو معطل ثابت ہوا۔ وہ اسی بات کو غنیمت سمجھتا تھا کہ حکومت خواہ گرگ چندر ہی کرے لیکن راجہ کا نام اور تخت و تاج میرے ہی قبضہ میں رہے۔ آخر اس کی کمزوریوں کی وجہ سے ملک میں پھر فتنہ و فساد شروع ہو گیا نتیجہ یہ ہوا۔ ۴ ماہ کی حکومت کے بعد سلہن کو تخت و تاج سے الگ ہونا پڑا۔ پھر گرگ چندر کی مدد سے اوچل کے بھائی سسل نے ۱۱۱۲ء میں حکومت حاصل کی۔ اس کی پہلی مرتبہ کی حکومت (تا ۱۱۲۷ء) کشمیر کے زبردست فرقہ ڈامر کی مدافعت میں ہی گذر گئی۔ اس کے پہلے دور حکومت کا مشہور واقعہ یہ ہے کہ اس نے بہت سی ترکیبوں اور تدبیروں اور ملکی چالبازیوں کے بعد اس شخص (گرگ چندر) کو ٹھکانے لگا دیا تھا جو راجہ نہ ہونے کے باوجود تمام رعایا کا مالک بلکہ خود راجہ پر غالب اثر رکھتا تھا اور جس سے کئی راجے خوف کھایا کرتے تھے۔ آخر راجہ ہرش کے پوتے بھکشا چر (یا بھکشو) کیلئے اس کو بھی تخت کشمیر خالی کر کے دوسرے علاقہ میں فرار ہونا پڑا۔ بھکشا چر ایک سال ہی حکومت کرنے پایا تھا کہ رعایا

لے تنگ اور پریشان ہو کر (کیونکہ اس کی برائے نام حکومت سے ملک میں چور دقعدی کا زور ہو گیا تھا) پھر سسل کو یاد کیا۔ اور آخر ۱۱۲۱ء میں وہ دوبارہ کشمیر کا فرمانروا ہوا۔ اور ۷ سال تک حکمران رہا۔ اس زمانہ میں پنڈت کلہن کی عمر کا اندازہ ۲۴-۲۵ سال تک لگایا گیا ہے۔ بسل نے یہ سات سال خانہ جنگی میں ہی بسر کئے اور اس کے علاوہ آتشزدگی اور قحط نے ملک میں اور بھی افسوسناک تغیر پیدا کر دیا آخر ۱۱۲۸ء میں جب وہ ایک قاتلانہ سازش کا شکار ہو گیا تو اس کا بیٹا جے سنگھ تخت نشین ہوا۔ جس کے عہد حکومت میں کلہن نے اپنی تصنیف لکھی ہے ۱۱۴۵ء تک جے سنگھ کو بھی زبردست ڈامردں اور دعویداران سلطنت بھوج اور لوہن اور اس کے بھتیجے ملاجن کے ساتھ ہی جنگ و جدل میں گذارنے پڑے اور ہرچند کہ ۱۱۴۵ء کے آخر میں بھوج سے جو آخری دعویدار رہ گیا تھا۔ صلح کر کے ملک کو تکالیف و مصائب سے کسی قدر نجات دلائی مگر اندرونی فساد اور بغاوتوں کی آگ کو مشتعل ہو کر شعلے اور شرارے پیدا نہ کرتی تھی۔ لیکن دھواں ضرور دیئے جاتی تھی ان واقعات اور حالات سے جو کلہن کی پیدائش سے لیکر اس کی کتاب کے سال تصنیف تک شمار کئے جاتے ہیں۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کلہن کی زندگی زمانہ کے نشیب و فراز انقلابات اور عبرت انگیز کیفیتوں کا ایک دلاویز مرقع تھی۔ اور جس کا بہت بڑا حصہ ان امور کا ذاتی تجربہ تھا۔ جو راجوں کے عروج و زوال اور لاکھاد راکھ کے متعلق ہیں۔ اور راج ترنگنی کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان

واقعات کا کلہن پر گہرا اثر ہوا ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب میں اس نے بیسیوں ایسے اقوال اور الفاظ درج کئے ہیں۔ جو آج ضرب المثال کے طور پر مشہور ہیں اور جنہیں راجوں کو بھی نصیحتیں ہیں۔ اس کے درباریوں کو بھی اور عام رعایا کو بھی ملک کی سیاسی حالت کلہن کے زمانہ میں افسوسناک نہیں بلکہ قابل رحم تھی متواتر خانہ جنگیوں بعض راجوں کی بے اختیاری دبیدست دپائی خودسر حاکموں کے نظام اور محصولات کی زیادتی وغیرہ کی وجہ سے رعایا روز بروز تباہ ہو رہی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ کشمیر کا فرمانروا تبت۔ لداخ۔ ماورالنہر۔ قنوج چنبہ۔ پنجاب۔ بنگال۔ نیپال اور لنکا تک کے راجوں سے خراج لیتا اور ان پر حملے کیا کرتا تھا۔ بلکہ بعض وقت گھر سے باہر نکلتا تھا۔ تو دنیا کے فتح کرنے کا ارادہ لے کر نکلتا تھا۔ لیکن اب نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ بیرونی ممالک قریبًا سب ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ اور باہمی نفاق وحسد اور اندرونی فتنہ وفساد کی وجہ سے کشمیر کا تخت بھی ہر وقت نقش بر آب کی صورت رہتا تھا۔ اور لوگوں کو جن کی نگاہیں معمولی گرد وغبار میں بہت بڑی آندھی اور طوفان کی آمد ورفت کو دیکھ لیا کرتی ہیں۔ یہ خطرہ ہر وقت درپیش رہتا تھا کہ اگر کسی بیرونی دشمن تک گھر کی خرابی کی خبر پہنچ گئی۔ تو نہ صرف رعب و اقتدار میں ہی فرق آ جائیگا۔ بلکہ حکومت اور ملک بھی ہاتھ سے جاتا رہیگا۔

کلہن کی آزادنگاری اور صاف گوئی

کلہن کا باپ راجہ ہرش کے زمانہ میں ایک اعلیٰ فوجی عہدہ پر مامور تھا لیکن خود کلہن نے اپنے زمانہ کے کسی فرمانروا کے ماتحت کوئی

خدمت قبول نہیں کی۔ اس کو علمی مطالعہ شاعری اور واقعہ نویسی کا شوق تھا
اور وہ تا دم واپسین اسی مشغلہ میں مصروف رہا۔ بعض مورخوں کا قاعدہ ہے
کہ وہ کسی والیٔ ملک کے حکم سے کوئی کتاب یا تاریخ لکھتے ہیں جسمیں انہیں
اپنے ممدوح کے ہر نقص کو خوبی اور ہر خوبی کو ایک گرانمایہ جوہر ظاہر کرنا
پڑتا ہے۔ بعض مورخ کسی امیر یا راجہ مہاراجہ کے نام پر اس کے ملک کی
تاریخ لکھکر اس کے نام ڈیڈیکیٹ (معنون) کر دیتے ہیں جس سے ان کی
صداقت نویسی اور آزادنگاری میں فرق آجاتا ہے۔ لیکن کشمیر کا مورخ ہندوستان
قدیم کا بہترین مورخ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان تمام عیوب سے ایسے ہی پاک ہے
جیسے وہ ثالث جس کو سوائے عدل و انصاف کے کوئی چیز کسی رعایت یا
لحاظ پر مجبور نہیں کر سکتی۔ کلہن نے اکثر راجاؤں کی سخت مذمت کی ہے
ان برائیوں کے لئے جو ان میں موجود تھیں اور ان کی تعریف کی ہے۔ ان
نیکیوں کے متعلق جو کبھی کبھی ان سے ظہور میں آتی تھیں۔ کلہن نے راجہ
جے سنگھ کے زمانہ میں اپنی تاریخ کو مرتب کیا ہے۔ اور یہ بھی مشہور ہے
کہ یہ تاریخ راجہ جے سنگھ ہی کے حکم سے لکھی گئی تھی۔ لیکن جب جے سنگھ
کے حالات پر (جو راج ترنگنی میں تفصیل سے لکھے گئے ہیں)، نظر ڈالی
جاتی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس قابل مصنف نے نہایت آزادی
اور صاف گوئی سے اپنے زمانہ کے فرمانروا کے عہد حکومت پر بحث کی
ہے۔ اور راجہ کے ذاتی کیریکٹر کے اظہار پر بھی اس جرأت سے کام لیا
ہے۔ جو ہر ایک آزاد اور ایماندار مورخ کا فرض ہے راجہ کی علم دوستی

اس کے عابدانہ کام اور اس کی نیک خصلتوں کا ذکر مناسب تعریفی الفاظ میں کیا ہے لیکن جہاں راجہ نے کوئی غلطی کی ہے اور اس غلطی کا نتیجہ بیچاری رعایا کو برداشت کرنا پڑا ہے۔ وہاں اس نے نہایت آزادی ایمانداری صاف گوئی اور اخلاقی جرأت سے کام لیکر راجہ کو سرزنش کی ہے۔ اور اس کی دغابازی تباہ کن روش اور ان مصیبتوں کو صاف اور واضح الفاظ میں لکھا ہے۔ جو اس کے عہد حکومت میں اہل کشمیر پر نازل ہوئی رہیں۔

کلہن کی وفات

کلہن کی پیدائش کا اندازہ ۱۰۹۷ء یا ۱۰۹۸ء میں کیا گیا ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ کلہن اپنے باپ چمپک کے ساتھ جبکہ راجہ ہرش کے زوال کی وجہ سے وہ ملکی معاملات سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ یقیناً تیرتھوں کی جاترا کو بھی جاتا ہوگا۔ اور اس زمانہ میں ۱۱۳۶ء کے قریب جب چمپک کی عمر ۶۴ سال بتائی جاتی ہے کلہن کی عمر ۳۶ سال سے زیادہ تھی کلہن کی تصنیف کا سال ۱۱۴۸ء یا ۱۱۴۹ء قیاس کیا جاتا ہے۔ اس وقت اسکی عمر ۵۰ سال سے زیادہ تھی ۱۱۵۰ء تک کے جس قدر واقعات راجہ جے سنگھ کے عہد حکومت میں قابل ذکر تھے۔ وہ کلہن نے اپنی تاریخ میں تفصیل وار لکھ دیئے ہیں لیکن اس کے بعد کوئی واقعہ درج نہیں ہے۔ بلکہ جہاں جے سنگھ کی حکومت کا ذکر ختم کیا ہے۔ وہاں مندرجہ ذیل الفاظ لکھے گئے ہیں۔

"راجہ جے سنگھ جب تخت پر بیٹھا ہے۔ اس کی عمر ۲۲ سال کی تھی اب لوکک سمت ۴۲۲۵ مطابق ۵۰-۱۱۴۹ء میں اسکی حکومت کو بھی ۲۲ سال گذر چکے ہیں۔

گویا اس کی عمر اب ۴۴ سال کی ہے۔ خدا کرے اس راجہ کی کامل دانائی فراست جو اور بہت کم حکمرانوں میں پائی گئی ہے بہت زیادہ عرصہ تک رعایا کے سروں پر قائم رہے!! مکمل تاریخ کشمیر حصہ اول میں لکھا ہے کہ راجہ جے سنگھ نے ۱۱۶۲ء میں ایک شبخون مارا۔ چونکہ راج ترنگنی میں ۱۱۵۰ء سے ۱۱۶۲ء تک کے حالات راجہ جے سنگھ کے نہیں ہیں۔ اس لئے خیال یہ ہے کہ کلہن پنڈت کی موت بھی انہی سالوں میں واقع ہوئی ہوگی۔ اگر وہ زندہ ہوتا۔ تو ان ۱۲ سال کے واقعات بھی ضرور قلمبند کر جاتا۔ اس لحاظ سے اس کی عمر کا اندازہ ۶۰ سال کے قریب لگایا جاسکتا ہے۔

کشمیر کے مورخ کلہن سے پہلے اور مابعد

کلہن سے پہلے بھی کشمیر میں کئی مورخ گذر چکے ہیں اور ہر چند کہ ان دنوں چھاپے اور اشاعت علم کا رواج نہ تھا تاہم کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ اور ملک میں مقبول ہوتی تھیں۔ کلہن لکھتا ہے کہ نیل مت پوران کے علاوہ میں نے گیارہ ادر ایسی کتابوں سے اپنی تصنیف میں مدد لی ہے۔ جو راجاؤں کے حالات کے متعلق ہیں۔ ان میں سے تین کتابوں کے نام معلوم ہوسکے ہیں۔ کشن سنیدر نامی ایک کشمیری شاعر اور مورخ نراولی (فہرست راجگان) کے نام سے ایک تاریخی لکھی ہے۔ یہ مورخ کلہن سے ایک صدی پہلے ہو گذرا ہے۔ اس کتاب کے متعلق سٹائین صاحب مترجم انگریزی راج ترنگنی لکھتے ہیں کہ میں نے اس کی تلاش کیلئے کشمیر میں انعام کی

کافی رقم کا اشتہار دیا۔ لیکن یہ کتاب کسی لالچ اور کسی انعام پر بھی کہیں دستیاب نہ ہو سکی۔ دوسرے مورخ کا نام پرم مہر ہے جس کی تاریخ سے کلہن نے آٹھ راجاؤں کے نام حاصل کئے ہیں۔ ان کے بعد کلہن کا نام ہے جس نے جے سنگھ کے حالات لکھے ہیں۔ کلہن کے بعد زدنراج نے جے سنگھ سے مسلمان بادشاہ سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ تک اور شری ور پنڈت نے بڈشاہ سے اکبر تک کی سلطنت کشمیر کا حال لکھا ہے۔ ان کے بعد اکثر مسلمان مورخین ہوئے ہیں جنہوں نے نہایت تفصیل سے واقعات وحالات قلمبند کئے ہیں لیکن جس رنگین بیانی اور کثرت ضرب الامثال اور آزادخیالی سے کلہن نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ بہت کم مورخ اس کا نمونہ دکھا سکتے ہیں۔ چنانچہ سٹائن صاحب لکھتے ہیں: "کلہن میں مذاق کا وہ احساس اور مردم شناسی کا وہ جوہر اور انسانی خصائل سے باخبر ہونے کا وہ ملکہ پورے طور پر موجود تھا۔ جو کشمیریوں کا ورثہ ہے۔ اور جس پر کشمیریوں کو بجا ناز ہے۔

حکمت کے موتی

"وہ راجہ نہایت ہی خوش قسمت ہے جو رات کے وقت بےفکری سے پاؤں پسار کر سونے سے پہلے اس بات کا اطمینان کر لیتا ہے کہ اس کی رعایا جسے وہ اپنے بال بچوں کے برابر عزیز سمجھتا ہے۔ اپنی اپنی جگہ آرام سے ہے۔"

یہ الفاظ اس تنگدلی اور رحم مجسم راجہ کے ہیں جو تنجن یا نونجین اول کے

نام سے حضرت مسیح سے ۸۰۲اسال (اور آج سے) ۲ ہزار ا۴۱ سال پیشتر کشمیر جنت نظیر کا فرمانروا تھا۔ یہ راجہ ۳۶ سال تک تخت سلطنت پر جلوہ افروز رہا۔ اس کی رانی واک پشٹا (معنی صادق القول) واقعی اسم بامسمیٰ تھی۔ راجہ اور رانی اپنی رعایا کی بہتری میں مصروف تھے۔ کہ دفعتاً برف کی شدت سے ملک کی تمام فصلیں تباہ ہوگئیں۔ قحط نے اس ملک پر وہ مصیبت نازل کی۔ کہ باپ بیٹے کا اور ماں بیٹی کی خبر گیراں نہ تھی۔ راجہ نے نہ صرف اپنے خزانہ بلکہ امیروں اور وزیروں کے مشترکہ روپیہ سے غیر ملکوں سے غلہ منگا کر ملک میں تقسیم کیا۔ مگر انسانی طاقت سے قدرت کا مقابلہ نہ ہوسکا۔ خزانہ کے بالکل خالی اور رعایا کے حد سے زیادہ تباہ ہو جانے پر راجہ نے خودکشی کا ارادہ کیا۔ اور اس ارادہ کو اپنی ایک طویل تقریر کے ساتھ اپنی رانی پر ظاہر کیا جسمیں عنوان متذکرہ صدر کے علاوہ یہ الفاظ بھی تھے "بہتر ہے کہ رعایا کی خاطر اپنی جان نثار کردوں۔ شاید اس نابکار کا صدقہ بارگاہ الٰہی میں قبول ہو کر عوام کی نجات کا باعث ہو"

ہندوستان میں بہت راجے اور بادشاہ ہوئے ہیں مگر مادر گیتی کوئی ایسا فنا فی الرعایا راجہ آجتک پیدا نہیں کرسکی۔ جو اپنے ملک اور اپنی رعایا پر سے محض رعایا کی بھلائی کیلئے تصدق ہونے کو تیار ہوا ہو۔ اگر فی الواقعہ تمام راجے مہاراجے نواب اور بادشاہ بستر استراحت پر جانے سے پہلے اس بات کا اطمینان کرلیں کہ ہماری رعایا بھی

ہماری ہی طرح بے فکری سے پاؤں پسارے خراٹے لے رہی ہے۔ تو بڑے بڑے مہابلی دیوتا بھی ان کے سامنے ایک ناچیز ہستی ثابت ہوں مگر افسوس کہ ہمارے اکثر نواب اور راجے عیش و عشرت میں مست ہو کر اپنے ملک اور اپنی رعایا کی حقیقی جگر دوز حالت سے مطلق لاعلم ہیں چار پانچ سال کا عرصہ گذرا ہے۔ کہ کوہستان کانگڑہ کی ایک پہاڑی ریاست کی رعایا نے کئی ہزار کی تعداد میں جمع ہو کر وزیر ریاست پر حملہ کر دیا۔ اور جیل خانہ کے قیدیوں کو آزاد کر دیا تھا۔ اس کی بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وزیر کے ظلم و ستم سے رعایا نالاں تھی اور راجہ کوئی توجہ نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اس نے تمام کاروبار وزیر کو سونپ کر شراب و کباب کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔

٢- اگر بڑے آدمیوں میں ان مصیبتوں کو جن کے سامنے معمولی آدمی حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں۔ دور کرنیکی طاقت نہ ہوتی۔ تو ان کی بڑائی کا نشان ہی کیا تھا۔

یہ دلیرانہ اور امید سے بھرے ہوئے الفاظ رانی ودک پشٹا کی زبان سے اس وقت نکلے تھے جبکہ راجہ تنجین چاروں طرف سے مایوس ہو کر خودکشی کرنے پر آمادہ تھا۔ رانی پتی برت دھرم کا پالن کرنیوالی رانی ظہور اسلام سے کئی سو سال پہلے ہی "لاتقنطوا" کی قائل تھی وہ کہنے کو رانی تھی۔ لیکن مردانہ اوصاف سے معرا نہ تھی۔ اس مختصر سے جملہ نے راجہ کے مردہ جسم میں روح پھونک دی۔ اور وہ اب اس قوت اور طاقت اور عقل اور فکر کو جو چنتا کی آگ کے شعلوں کی نذر ہونیوالی تھی۔ رعایا

کی بہتری میں صرف کرنے لگا۔ اور آخر اس جوڑہ کی بے عیب زندگی کی طرح آسمان بالکل صاف ہوگیا۔ اور رعایا کی بے چینی دور ہونے لگی۔

بڑے آدمیوں کی واقعی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ اگر بابر یا ہمایوں میں امیر عبدالرحمٰن خان (کابل) یا اور ایسے ہی بادشاہ جن کی ابتدائی زندگی مصائب و تکالیف میں بسر ہوئی ہے۔ جی چھوڑ بیٹھتے۔ تو آج کوئی ان کا نام بھی نہ جانتا۔ بڑے آدمیوں کو وہی باتیں زیبا ہیں۔ جو ان کے شایان شان ہوں۔ اور جو دوسرے لوگوں کے لئے نیک نمونہ کا باعث ہو سکیں۔ مثلاً اگر کوئی بڑا آدمی محض نام و نمود کے لئے فضول بلکہ مخرب اخلاق مراسم پر روپیہ بیدریغ خرچ کرتا ہے۔ تو ان سے کم درجہ کے لوگوں کو بھی اس کی تقلید کرنی پڑتی ہے جو ملک کی تباہی کا باعث ہے۔ لیکن اگر بڑے آدمی کوئی نیک کام کریں۔ تو ان کی تقلید و پیروی سے ملک اور قوم کی حالت سدھر سکتی ہے۔ اگر راجہ تنجین شدت قحط اور رعایا کی مصیبت کے باعث خودکشی کر لیتا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ قحط تو بدستور ہی رہتا۔ مگر اس کے ساتھ ملک میں بدامنی پھیل جاتی۔ اور لوگ اپنے راجہ کو خودکشی کرتے ہوئے دیکھکر نہ صرف حوصلہ ہی چھوڑ بیٹھتے۔ بلکہ خود بھی حرام موت مر جانے پر آمادہ ہو جاتے رانی کی نصیحت واقعی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ جو لوگ بڑا بننے کی آرزو رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ پہلے سے "بڑے" ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ ہر مشکل اور ہر مصیبت میں اولوالعزمی دکھایا کریں۔ کیونکہ

اونوالعزمان دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں سمندر چیرتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

۳۔ آتشی شیشے کی سطح پر جب تک سورج کی کرنیں پڑتی رہتی ہیں۔ وہ تمام اطراف میں

چمکتا رہتا ہے ورنہ وہ بالکل نہیں چمکتا کیونکہ وہ محض پتھر ہے۔

سنہ ۹۰ء مطابق سمت ۱۵۲ بکرمی میں کشمیر راجہ ماترگپت کے زیر نگین تھا۔ ماترگپت ایک فلک زدہ برہمن تھا۔ لیکن راجہ بکرماجیت والئے اجین کی نظروں میں بلحاظ اپنے علم وفضل اور نسلے جذبات سے بھری ہوئی شاعری کے نہایت عزیز تھا۔ بکرماجیت نے اس کو کشمیر کی حکومت دلادی۔ کچھ عرصہ کے بعد بکرماجیت کا انتقال ہوگیا۔ جب ماترگپت کو خبر ہوئی۔ تو اس نے تخت وتاج کو جواب دیکر گوشہ تنہائی اختیار کرلیا اور آخر ہندوستان کو روانہ ہوا۔ راہ میں راجہ پرورسین سے ملاقات ہوئی۔ جو راجہ بکرماجیت کی وفات کی خبر سنکر اپنا کھویا ہوا ملک واپس لینے کے لئے کشمیر ہی کی طرف جارہا تھا۔ پرورسین کو جب ماترگپت کی ترک سلطنت کا حال معلوم ہوا۔ تو اس نے اس کا باعث پوچھا تو ماترگپت نے جو جوابدیا۔ وہ اس مضمون کے عنوان پر درج ہے۔

ایک شریف اور صحیح النسب اور سعادت مند آدمی اپنے آقا کی عظمت شوکت اور اس کے متعلق اپنی وفاداری وعقیدتمندی اس سے بڑھکر اور کن الفاظ میں ظاہر کرسکتا ہے۔ وہ لوگ جو آگ کو مکھن میں ڈالتے ہیں۔ یا اناج کو بنجر زمین میں بوتے ہیں۔ اگر یہ توقع کرتے ہیں کہ مکھن سلامت رہیگا۔ اور اناج اچھا پیدا ہوگا۔ تو اپنی ناتجربہ کاری اور

نکوئی بابداں کردن چناںست   کہ بدکردن بجائے نیک مرداں

کا پورا پورا ثبوت دیتے ہیں۔ پس جہانتک ہوسکے ہر نااہل۔ احسان فراموش اور مارآستین ملازم یا غلام سے بچتے رہو۔ اور اگر کوئی نیض اور نیک سلوک کرو۔ تو ایسے ہی شخص سے جیسا کہ ماترگپت تھا۔ اور جس نے مالک کی بے خبری بلکہ اس جہان سے چلے جانے کے بعد بھی یہی کہا کہ وہ آفتاب عالمتاب تھا۔ میں آتشی شیشہ ہوں اب جبکہ وہ غروب ہوگیا ہے۔ میری چمک بھی زائل ہوگئی ہے۔ اور اسی لئے ماترگپت کی داستان گنگا کے پانی کی طرح آجتک پوتر چلی آتی ہے۔ اور جب تک دنیا قائم ہے۔ پوتر چلی جائیگی۔

۴۔ اگر راجہ خود ہی اپنا رعایا کی بیویاں اڑالے پر آمادہ ہوجائے تو قانون کی خلاف ورزی کے لئے سزادینے والا کون رہیگا؟

سنہ ۶۵۲ مطابق سنہ ۷۰۹ بکرمی میں تخت کشمیر پر راجہ پرتاب ادتیہ امور تھا جس نے ۵۰ سال تک حکومت کی ہے۔ ایک سوداگر نے ایک دفعہ اس کی دعوت کی جس میں سوداگر کی بیوی نریندر پربھا بھی شامل تھی۔ راجہ اس کو دیکھکر بیتاب ہوگیا۔ سوداگر کی بیوی بھی راجہ پر فدا ہوگئی۔ آخر راجہ بادل نخواستہ اپنے محل کو واپس آیا۔ عشق نے فہم و عقل کو زائل کرکے قوت فیصلہ اور ذہنی قابلیتوں کو جواب دیدیا تھا۔ تاہم چونکہ وہ نیکدل راجہ تھا۔ بدی کے خوف سے خائف ہوکر خود ہی وہ الفاظ زبان پر لایا۔ جو اوپر لکھے جاچکے ہیں۔ ادھر سوداگر کی بیوی بھی بیکل

رہتی تھی۔ سوداگر کو حقیقت حال سے خبر ہوئی۔ اس نے رقاصہ کی حیثیت سے بیوی کو مندر پر چڑھا دیا۔ جہاں سے راجہ اسے اپنے محل میں لے آیا۔ جب شاہزادہ سلیم نے مرزا غیاث کی بیٹی مہرالنسا بیگم سے کچھ چھیڑ چھاڑ کرنی چاہی تھی۔ اور جب اس کی خبر اکبر کو پہنچی تھی۔ تو اس نے بھی بیٹے کو ایسے ہی الفاظ میں کہا۔ کہ بادشاہ ہو کر رعایا کی بہو بیٹیوں کو دیکھنا بھلے آدمیوں کا کام نہیں ہے۔ کاش! وہ راجے اور رئیس اور ذمہ دار اعلےٰ اہلکار راجہ درلبھک وردھن اور شہنشاہ اکبر کے ان الفاظ پر عمل پیرا ہو کر جوانی کے باغ سے خرابی کا پھل پیدا کرنیوالے اس زہریلے درخت کو نابود کر دیں۔ جسے جذبۂ حیوانی اور خواہشات نفسانی کہتے ہیں۔

۵۔ جس طرح بجید غلیظ دھوئیں کے بنے ہوئے بادلوں سے کر جمع ہونے سے صاف پانی برستا ہے یا جس طرح کند پتھروں کی چٹان سے بہت تیز لوہا نکلتا ہے یا جس طرح برف سے چمکدار آگ پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی ادنےٰ نسلوں سے اکثر اعلےٰ چال چلن کے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔"

یہ الفاظ پنڈت کلہن نے اپنی راج ترنگنی میں اس موقع پر استعمال کئے ہیں جب رانی نریندر پربھا (جو پہلے سوداگر کی بیوی کی حیثیت سے ایک معمولی عورت تھی) کے بطن سے راجہ درلبھک عرف پرتاپ ادتیہ ثانی کے گھر میں وہ مشہور اور شجاع اور فاتح بیٹے پیدا ہوئے۔ جن کا نام راجہ چندر پیڑ اور راجہ للتا دتیہ ہے۔ اور جن کے نام سے تاریخ کشمیر کو خاص عزت اور زینت ہے ان شاہزادوں کی اعلےٰ صفات نے رانی کی بدنامیاں (کہ وہ پہلے سوداگر

کی بیوی تھی۔ پھر راجہ کی رانی بنی۔ اسیطرح دور ہو گئیں جس طرح کسی کان سے نکلے ہوئے جواہر کی وہ غلاظت اور مٹی دور کر دیجاتی ہے جو پیدائشی طور پر اسکے ساتھ شامل ہوتی ہے

۶۔ وہی شریف دل والے نوکر اس دنیا کو پوتر بناتے ہیں۔ جو اپنی جان تک کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ راجہ غلط راستہ پر نہ جانے پائے۔

راجہ للتہ دتیہ سے جو تخت کشمیر پر ۷۱۵ء سے ۷۵۲ء تک حکمران رہا ہے ایک دفعہ شراب کے نشہ میں چور ہو کر راجہ پرورسین کے آباد کردہ شہر پراس پور کے جلائے جانے کا حکم صادر کر دیا۔ لیکن جب نشہ دور ہو گیا اور اپنی حماقت معلوم ہوئی تو بہت افسوس کیا۔ اور دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔ وزرا امرا کو جب راجہ کے صدمہ کا حال معلوم ہوا۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ نے بیشک حکم دیدیا لیکن ہم ایک غلطی پر دوسری غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ شہر صحیح سالم موجود ہے۔ چنانچہ راجہ بہت خوش ہوا۔ اپنے وزرا کی تعریف کی۔ اور حکم دیا کہ آئندہ بحالت نشہ جو حکم میری زبان سے نکلے۔ وہ قابل تعمیل نہ سمجھا جائے۔ اسی موقعہ پر پنڈت کلہن نے راجوں مہاراجوں کے اصلی خیر خواہ اور صاف گو نوکروں کی تعریف میں مندرجہ عنوان الفاظ اپنی مشہور کتاب راج ترنگنی میں بیان کئے ہیں۔ کاش اس زمانہ میں ایسے لوگ میسر آسکتے جو خوشامد و چاپلوسی کی بجائے معاملہ فہمی اور صاف گوئی اور آزادی سے کام لے سکتے۔

۷۔ ہاتھی کا کان اس وقت بھی ہلتا رہتا ہے جب مکھیاں اس کی کنپٹی کا رس حاصل کرنے کے لئے جمع ہونے سے ہٹ جاتی ہیں۔ شیر اس وقت بھی مڑ مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھتا رہتا ہے جب ہاتھیوں کا گلہ اس کے پیچھے نہیں آتا۔ ہوا اسوقت بھی

جھنکارنے سے باز نہیں رہتا جب بادلوں کی تو تھا اس سے دور ہو جاتی ہے۔
یہ الفاظ کملا نامی ایک رقاصہ کے ہیں۔ جو پونڈر در دہن واقعہ ملک گوڑ (بنگال)
کی رہنے والی تھی۔ راجہ جیا پیڈ جس نے ۳۱ سال ۷۶۴ء سے ۷۹۵ء تک کشمیر
میں جاہ وجلال سے حکومت کی ہے۔ جب بہ تبدیل لباس بنگال کے ملک میں
پہنچا تو وہ ایک مندر کے دروازے کے بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔ عادت کے
مطابق اس کا ہاتھ بار بار پیچھے کی طرف جاتا تھا۔ رقاصہ نے اس کے
چہرے سے غیر معمولی آثار اور اس طرح سے اسکی پان چبانے کی عادت دیکھکر
وہ اشلوک بیان کیا۔ جو اوپر کی سطور میں لکھا جا چکا ہے جس کا مطلب یہ ہے
کہ عادات اس صورت میں بھی دور نہیں ہو سکتیں۔ جبکہ انہیں پیدا کرنے والی
کوئی وجہ بھی باقی نہ رہی ہو۔ اسی طرح عربی میں ایک مقولہ ہے جس کا ترجمہ
یہ ہے۔ کہ "عادت موت کے ساتھ ہی جاتی ہے"

۸۔ وہ دولت جسے سوداگر امانت میں خیانت کر کے فاحشہ عورتیں اپنے چاہنے والوں
کو دھوکا دیکر یا راجہ دغا بازی سے حاصل کر لیتے ہیں ہمیشہ رہنے والی نہیں ہوتی۔

راجہ جیا پیڈ کی ۳ سالہ غیر حاضری وسیر وسیاحت اور فتوحات عظیمہ کے زمانہ
میں ججا نامی ایک شخص جو راجہ کا سالا بھی تھا کشمیر کے تخت پر قابض ہو گیا
تھا۔ راجہ نے واپس آکر اس کو ہلاک کیا۔ اور حکمرانی کا بار ایسی ہی آسانی سے
اٹھا لیا جس آسانی سے کہ وہ لوگوں کے دلوں کو موہ لیا کرتا تھا۔ پنڈت
کلہن مصنف راج ترنگنی نے اس موقعہ پر جبکہ راجہ کے ایک رشتہ دار نے امانت
میں خیانت کرلی اور دغا بازی سے ہوائی جاہ وجلال حاصل کر لیا اور پھر

جس کا انجام موت کے ساتھ ہوا۔ یہ اشلوک بیان کیا ہے ان مختصر اور جامع الفاظ میں بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اسکی تفسیر کیلئے بہت وقت درکار ہے۔ خائن پر چاروں طرف سے لعنت برستی رہتی ہے۔ فاحشہ عورتیں اپنی دکھاوے کی محبت میں جس خود غرضی سے کام لیتی ہیں اس سے ایک دنیا واقف ہے۔ جو وزیر یا ذمہ دار لوگ اپنے راجہ کی غیر حاضری میں اس کا ملک دبا لیتے ہیں۔ وہ بھی دیرپا نہیں رہتا۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے بھی اگر غرض کے بندے ابتدا کی عیش میں بیخود ہو کر اپنے انجام سے بے خبر ہیں۔ تو کس قدر افسوس کی بات ہے

۹۔ علم کا درخت جس پر بیوقوف بیٹھتے ہیں اسکی جڑ یا شہنیاں وغیرہ نہیں ہوتے البتہ اس کا پھل مصیبت کے وقت ایک ہی مرتبہ ان کی مصیبت کو دور کر دیتا ہے۔

جیا پیڑ دنیا کو فتح کرنے کے ارادہ سے ایک بار پھر کشمیر سے باہر نکلا۔ راج ترنگنی میں لکھا ہے کہ کوہستان ہمالیہ سے لیکر مشرقی سمندر کے کنارے تک اسکی فوجیں پھیلی ہوئی تھیں۔ چونکہ اسے یہ تبدیل لباس پھرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ ایکدفعہ سادھو کا بھیس بدل کر ایک مشرقی راجہ بھیم سین کے قلعہ میں اس کے کمزور مقامات کی دیکھ بھال کے لئے داخل ہو گیا۔ مگر وہاں اس کا ایک ادرسانندہ نامی (جو جج کا بھائی تھا) مقیم تھا۔ اس نے راجہ کو پہچان کر گرفتار کرا دیا لکھا ہے کہ گرفتاری کے وقت بہادر دل کے اس بہادر راجہ کو ذرا بھی تشویش نہ ہوئی بلکہ وہ اندر ہی اندر اپنی رہائی کی تدابیر سوچتا رہا۔ انہی دنوں میں راجہ بھیم سین کے ملک میں لوٹا دا ایک بیماری کی متعدی وبا پھیل گئی جس سے ملک ویران ہونے لگا۔ چونکہ یہ مرض متعدی تھا اس لئے اس مرض کے مریض کو کوئی شخص ہاتھ

بھی نہیں لگتا تھا۔ بلکہ اس کو پتا تک بھی نہیں بیچا تے تھے۔ جیا پیڈ سے نے جو علم و فضل میں کمال رکھتا اور ہر قسم کے علوم سے آگاہ تھا کسی نہ کسی طریقہ سے اس مرض کے مصنوعی آثار پیدا کر لئے۔ چنانچہ دار دغہ جیل نے اس کو رہا کر کے باہر نکال دیا۔ اور اس طرح وہ اپنے علم کی طاقت سے بحر مصائب کو دور کر کے نہ صرف سلامتی کے کنارے جا لگا۔ بلکہ اس نے قلعہ کو بھی جس میں وہ قید تھا۔ چند ہی دنوں میں فتح کر لیا۔ اس موقعہ پر محل شناس کلہن علم کی تعریف میں وہ اشلوک بیان کرتا ہے۔ جو اوپر لکھا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ اب وہی کشمیر ہے۔ جہاں علم کی جگہ جہالت اور روشنی کی جگہ تاریکی اور بہادری کی جگہ بزدلی کا دور دورہ ہے۔

۱۰۔ "میں بے عزتی کے خوف سے تم سے پناہ مانگنے آیا تھا۔ لیکن تم نے جو میرے محافظ تھے۔ خود میری بے عزتی کی۔"

ایک راجہ کی اس سے بڑھکر اور کیا بےعزتی ہو سکتی ہے کہ اس کی رعایا کو اس کے سامنے ہی بے عزت اور ذلیل کیا جائے۔

"راجہ شریفوں کو ذلیل کر کے محض ایک تفریح سمجھتے ہیں۔ مگر آخر الذکر اسے اپنی موت سے بدتر خیال کرتے ہیں۔"

خودداری اور ذاتی اعزاز وہ چیز ہے کہ جان گنوا کر بھی اسکو حاصل کرنا چاہیئے

یہ حکمت کے موتی اور نصیحت کے کرن پھول انسان نہیں بلکہ ناگ (سانپ) کی زبان سے نکلے ہوئے بیان کئے جاتے ہیں۔ ان کی داستان عجیب و غریب ہے جس کو کلہن اپنی کتاب میں تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مہاپدم نام ناگوں (سانپوں) کے ایک راجہ نے جو جھیل وُلر میں پانی کے

اندر رہتا تھا۔ راجہ جیا پیڈ سے خواب میں جادوگر کے ہاتھ سے نجات کے لئے پناہ مانگی اور کہا کہ اس کے عوض میں سونے کی کان کا پتہ بتادونگا۔ جیا پیڈ نے تلاش سے اس ساحر کو طلب کیا۔ اور جادو کے علم کی بابت اس سے بحث کرتا رہا ساحر نے کہا کہ اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو میرے ساتھ چلیں۔ غرض راجہ ایک بہت بڑی جمعیت لیکر جھیل کے کنارے آیا۔ ساحر نے اپنے علم کے زور سے جھیل کو خشک کر دیا۔ کیچڑ میں انسانی چہرے کے ایک سانپ کو بیشمار چھوٹے چھوٹے سانپوں کے ساتھ تڑپتے دیکھا۔ ساحر نے کہا اگر اجازت دیں۔ تو میں اپنے جادو کے زور سے سانپوں کی اس دریائی بستی پر قبضہ کر سکتا ہوں راجہ نے منع کیا۔ اور آخر جادو ہی کے ذریعہ جھیل پھر پانی سے لبریز ہو گئی راجہ اس بات کا منتظر رہا کہ اب خواب میں مہاپدم اپنی جان بخشی کے عوض مجھے سونے کی کان کا پتہ بتانے آئیگا۔ چنانچہ خواب میں جو آوازیں طلائی کان کی خوشخبری کی بجائے اس کو سنائی دیں۔ وہ ان سطور کے عنوان میں لکھی جا چکی ہیں ان کے علاوہ مہاپدم نے یہ بھی کہا سونے کی کان کا پتہ دریافت کرنا چاہتے ہو کس مہربانی کے بدلے؟ کیا اس لئے کہ لوگوں کے سامنے میرے پردے کو فاش کیا اور میری عزت کو تباہ کر دیا۔ تاہم میری جان بخشی ضرور ہوئی ہے جس کے عوض ایک تانبہ کی کان کا پتہ بتاتا ہوں۔ جو فلاں پہاڑ پر واقع ہے اس داستان سے کم از کم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ذاتی اعزاز اور خودداری کی قیمت جان بخشی سے بھی زیادہ ہے اگر راجہ مہاپدم کی خودداری قائم رکھتا تو مہاپدم ضرور طلائی کان کا پتہ بتاتا۔ ایک زمانہ تھا کہ کشمیر میں خودداری قائم رکھنے کے لئے جانوروں

تک کو خیال تھا۔ اور اب یہ وقت ہے کہ لوگ ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں
اور محسوس نہیں کرتے جس ملک میں ذاتی اعزاز حاصل کرنے کے خیال یعنی
جائز آزادی اور مناسب حریت اور علوم و فنون سے کام نہیں لیا جاتا اسکی
تباہی و ذلت میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ بڑی ضرورت ہے اس بات کی کہ
کشمیر میں خود داری کو پیدا کیا جائے اور جھوٹی خوشامد اور بیعزتی کی زندگی
کے دور کرنے کے وسائل سوچے جائیں۔

۱۱۔ سمندر کی مچھلیاں اور راجہ اس لحاظ سے مشابہ ہیں کہ اول الذکر بادل کو اس خاص
صورت میں فیاض خیال کر لیتی ہیں کہ وہ انہیں کے پانی کو جذب کر کے چند قطرے ایسے
ان کو دیدیتا ہے۔ اور ایسے ہی آخر الذکر ان شریر خود غرض اہلکاروں کو وفادار اور
خدمتگذار خیال کر لیتے ہیں۔ جو ہر چیز کو لوٹ کر اس کا بہت ہی تھوڑا حصہ اسکو دیتے
یا اپنی ذاتی سرخروئی اور خیر خواہی جتانے کے لئے مالیہ وغیرہ کے مظالم بڑھاتے ہیں"

اہلکاروں کے پھندے میں پھنسکر جیاپیڈ نے عمر کے آخری حصہ میں مظالم اختیار
کئے۔ اہلکاروں نے اس کو بتایا۔ کہ فلاں امیر کے پاس اس قدر دولت ہے اسپر
کچھ ٹیکس لگنا چاہئے۔ مالیہ بہت کم ہے۔ اس کو بڑھانا چاہئے۔ فلاں امیر نے بڑا ہی
سے روپیہ جمع کر لیا ہے۔ وہ سب واپس لینا چاہئے۔ ان طریقوں سے دولت تو
جمع ہو گئی۔ لیکن رعایا ان مظالم کی تاب نہ لا کر چلا اٹھی۔ اہلکار نئے نئے
قانون بنا کر رعایا کو لوٹتے اور اس لوٹ میں سے کچھ حصہ راجہ کو بھی دے دیا
کرتے تھے۔ اس جبر و تشدد کی وجہ سے اکثر لوگوں نے جلا وطنی اختیار کر لی
اسی موقعہ پر پنڈت کلہن کہتا ہے۔ کہ جس طرح مچھلیاں بادل کو فیاض سمجھتی

ہیں بحالیکہ بادل سمندروں ہی کے بخارات کا نام ہے۔ اسی طرح راجے بعض
اہلکاروں کو جو ان کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اپنا خیر خواہ تصور کرتے ہیں بحالیکہ وہ
اسی کے ملک کو لوٹتے ہیں اور تباہ کرتے ہیں۔ بدقسمت ملکوں میں ایسے اہلکار
اب بھی موجود ہیں۔ جو زمینداروں اور عام رعایا کے ساتھ نہایت جبر و تشدد کا
سلوک کرتے ہیں۔ اور اپنے ذاتی فائدہ رسوخ یا ترقی کیلئے ملک یا تحصیل یا اپنے
علاقہ کی آمدنی کو ناجائز ذرائع سے بڑھا کر حاکم وقت کو خوش کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

۲۱۔ کون ایسا آدمی ہے جو ان منحوس اور ناپاک مالاؤں کو دیکھ کر خوش ہو سکتا ہے جنہیں
کسی مرتے ہوئے راجہ کی گردن سے اتارا گیا ہو کیسی شخص کے دل کو اس وقت صدمہ
نہیں ہوتا جب وہ گزشتہ راجاؤں کے ان زیورات کو چھوتا ہے جنہیں وہ موت
کے ساتھ جد و جہد کرتے ہوئے مخلف کے گرم آنسوؤں سے ناپاک کر چکے ہوں
دولت کی دیوی ہمیشہ ناپاک رہتی ہے۔ خواہ وہ سمندر کے پانی کے وسط ہی میں کیوں نہ ہو۔

راجہ اونتی ورمن جو ۸۵۵ء سے ۸۸۳ء تک کشمیر کا حکمران رہا ہے ایک
منصف مزاج اور دانا راجہ تھا جب تخت پر بیٹھا۔ اس نے گزشتہ راجوں کی عظمت
پر نظر دوڑائی۔ اور جب مال و دولت خزانے اور جواہرات اور زیور اس کے پیش کئے
گئے۔ تو ایک عبرت انگیز تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی اس نے اہل دربار
سے اسی وقت ایک لمبی تقریر میں جس کا خلاصہ ۲۱ میں اوپر لکھا گیا ہے دنیا کی
اس ناپائیدار دولت کو اس داشتہ عورت سے نسبت دی فی الحقیقت بہت کم
لوگ ہیں جو اس دیوی (لکشمی) کی محبت میں اپنا آپ سنبھال رکھنے کے قابل ہوتے
ہیں۔ اکثر لوگوں کو خصوصاً کم ظرفوں کو دیکھا گیا ہے۔ کہ وہ تھوڑی

سی دولت یا تھوڑا سا عروج حاصل کرنے پر فرعون بے سامان بن جاتے اور اپنی اصلیت کو جو نہایت کمینے اور رذیل خمیر سے مرکب ہوتی ہے۔ بھول جاتے ہیں۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ اکیلے آئے تھے اکیلے جائینگے۔ پھر حرص و ہوا میں اندھے ہوئے جاتے اور اس ڈھلتی چھاؤں کیلئے قصر تعلقات منہدم کرنے پر آمادہ رہتے ہیں جانتے بھی ہیں کہ جو کچھ ہے یہیں رہجائیگا۔ فوق لیکن پھر بھی حرص دامن جاتی نہیں چنانچہ راجہ اونتی درما نے تمام ایسی دولت اور زیورات اور سونے چاندی کو جس کا خزانہ ملک سے کوئی تعلق نہ تھا برہمنوں کو تقسیم کر دیا۔

۱۳۔ جس طرح ہاتھی نہانے کے بعد اپنے اوپر مٹی ڈال لیتے ہیں۔ اسی طرح بعض بڑے شہرت کی لہروں میں اپنے آپ کو پاک کر کے خطاؤں کی دلدل میں پھنسکر اپنے آپ کو ناپاک کر لیتے ہیں"

راجہ شنکر ورمن (عہد حکومت ۸۸۳ء سے ۹۰۲ء) جس نے غیر ملکی مہمات میں پنجاب تک کو اپنا مطیع کر لیا تھا۔ رعایا کی شامت اعمال سے بہت سی نیکیوں کے بعد اس وہم میں مبتلا ہو گیا۔ کہ کسی طرح خزانہ کو بڑھانا چاہیے۔ اور دست تطاول یہانتک دراز کیا۔ کہ مندروں کے اندر جو مال موجود تھا۔ وہ بھی لوٹ لیا۔ اسی موقعہ پر کلہن نے مندرجہ عنوان مقولہ بیان کیا ہے۔

۱۴۔ جس طرح جاندار پیدا ہو کر ان تکالیف کو بھول جاتے ہیں۔ جو انہوں نے رحم کے اندر رہکر برداشت کی تھیں۔ ویسے ہی راجہ تاج پر قبضہ پاتے ہی لمبے سالوں کے خیالات کو بھول جاتا ہے۔

کلہن نے جو کچھ لکھا ہے بالکل صحیح ہے۔ تخت نے خوش نصیب لوگوں کے پاؤں چومے ہیں۔ ان میں بہت لوگ نہ صرف اپنی شہزادگی کے مصائب اور دیگر تکالیف

ہی کو بھول جاتے ہیں بلکہ ان وعدوں کو بھی فراموش کر جاتے ہیں جو تخت پر بیٹھنے سے پہلے وہ اپنے ہم جلیسوں سے کرتے ہیں۔ لیکن مبارک ہیں وہ لوگ جو عیش میں رنج میں اور خوشحالی میں بیچارگی کو فراموش نہیں کرتے۔ یہ مقولہ بھی کلہن نے راجہ شنکر درمن ہی کے حالات میں لکھا ہے

۱۵۔ یمی مچھلی گو مقدس پانی میں رہتی ہے۔ تاہم اپنی ہی جنس کی مچھلیوں کو کھا جاتی ہے
بگلا ہر چند تارک الدنیا کی طرح خاموش رہتا ہے۔ تاہم وہ تمی کو تاک لگا کر پکڑتا ہے
اور اسے کھا جاتا ہے شکاری جو ایک عابد کی طرح جنگل میں رہتا ہے بگلے کو مار ڈالتا ہے

پنڈت کلہن نے راجہ شمبھو وردہن کے حالات (عہد حکومت ۹۳۵ سے ۹۳۶ء) میں ان سطور کو جن کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اس لئے لکھا ہے کہ راجہ شمبھو وردہن نے بہت سے دھوکے دیکر کشمیر کی حکومت حاصل کی تھی لیکن آخر کار اس کو بھی ایک سال کے بعد راجہ چکر درمن کیلئے تخت خالی کرنا پڑا تھا بعض نادان اپنے دشمنوں کو ذلیل ہوتے دیکھکر اور دھوکہ فریب دیکر اپنا مطلب نکال لینے پر خوشیاں مناتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سوچتے۔ کہ شائد کل ہم پر کوئی ایسی ہی مصیبت نازل ہو جائے۔ سے

اے دست بر جنازہ دشمن چو بگذری
غافل مشو کہ بر تو ہمیں ماجرا رود

۶۔ اس شخص سے بڑھکر کون قابل رحم ہو سکتا ہے جو بزور بازو حکومت حاصل کر کے اس وقت تو اپنے ہاتھ سے نکل جانے دے اور دوسرے دن اسے واپس حاصل کرنیکی کوشش کرے

راجہ شنو درمن ثانی کے عہد میں جو صرف ایک سال ہی (۹۳۹ء) میں حکومت کشمیر

کرنے پایا تھا۔ کمل وردہن نے وہ عروج حاصل کیا کہ بہت بڑی جمعیت لیکر بلا مخالفت محل شاہی میں داخل ہو گیا۔ چونکہ وہ سیاسی امور سے واقف نہ تھا برہمنوں سے کہنے لگا۔ کہ آپ لوگوں کے خیال میں جو طاقتور اور بالغ ہو۔ اس کو راجہ بنا لو۔ اس سے اس کا مطلب یہ تھا کہ لوگ مجھے ہی راجہ بنائیں گے لیکن اکثر لوگوں نے جو اس سے ناراض تھے۔ اس کے الفاظ سے فائدہ اٹھا کر شیکر کو مدد دی اور آخر میں وہی راجہ ہو گیا۔ کمل وردہن نے بعد میں بہت افسوس کیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ پنڈت کلہن نے اس موقعہ پر وہ مقولہ لکھا ہے جو ۱۶ میں لکھا گیا ہے۔

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجے

۱۷۔ علم (شاستر) اور تلوار (شستر) ان دونوں میں سے جب کوئی ایسا شخص کام لے جو صحیح اور غلط میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ تو ان سے سخت مصیبت نازل ہوتی ہے۔

علم اور تلوار دونوں اپنی اپنی جگہ بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں علم نے اپنے پُرزور قلم اور تلوار نے اپنی چمکدار دھار کے ذریعہ دنیا میں وہ کام کئے ہیں کہ ابھی تک صفحہ روزگار پر ان کے نشان پاتے ہیں۔ قلم اور تلوار دونوں بڑی نازک ذمہ داری کے کام ہیں۔ کوئی شخص جو صحیح قوت فیصلہ نہ رکھتا ہو۔ ان کے عظیم الشان بوجھ کے قابل نہیں ہے۔ یہ فقرہ کلہن نے اس موقعہ پر استعمال کیا ہے۔ جبکہ راجہ کشیم گپت (عہد حکومت ۹۵۰ء تا ۹۵۸ء) کی وفات کے بعد بعض دراندازوں نے وزیر سلطنت (پھلگن) اور رانی میں عداوت پیدا کر دی اور رانی اپنے وزیر سے بدظن ہو گئی۔ پھلگن نے

جب دیکھا کہ ان عداوتوں اور بدظنیوں سے ملک تباہ ہوا جاتا ہے۔ تو اس مردہ آقا کے لئے آہ وزاری کرتے ہوئے رانی کے قدموں پر اجو خود غرضوں کے کہنے سننے سے اسے غدار سمجھ رہی تھی) اپنی تلوار رکھدی جس سے رانی کا خوف رفع ہو گیا۔ اگر وزیر تلوار کے صحیح استعمال سے ناواقف ہوتا تو وہ اس وقت اپنا رسوخ بڑھانے ملک تخت حاصل کرنے کیلئے (جبکہ ولیعہد راجہ ابھی مینوا بھی نوعمر تھا) ملک کو تہ وبالا کرکے اپنی بیتیل طاقت سے کام لے سکتا تھا اور محمد علی شاہ قاچار والئے ایران کی طرح اپنے ہی ملک اور اپنی ہی قوم سے لڑکر؟ عاقبت اندیشی کا اظہار اور ملک کا ستیاناس کر سکتا تھا مگر اس نے وہ کام کیا۔ جو سلطان عبدالحمید خان غازی نے کیا تھا جبکہ اس کو تخت سے معزول کیا گیا تھا۔ یعنی اس نے چپ چاپ اپنے آپ کو برسر حکومت فریق کے حوالے کر دیا اور کسی لڑائی یا شور وشر سے کام نہیں لیا۔

۱۸۔ کسی راجکماری کی شادی ایک ایسے راجہ کے ساتھ ہونے میں جو عالمگیر فتوحات کے لئے آمادہ ہو۔ اور تنگدل برہمن کے ساتھ جس کا ہاتھ سنکلپ کے پانی سے تر رہتا ہو۔ کتنا فرق ہے؟

یہ شلوک پنڈت کلہن نے اس موقعہ پر لکھا ہے۔ جب راجہ سنگرام راج نے (عہد حکومت ۱۰۰۳ء تا ۱۰۲۸ء) اپنی بیٹی لوٹھ کی شادی صرف امداد اور قوت حاصل کرنے کے لئے ایک برہمن پریم نام سے کر دی جو دولت اور ہمت میں عظیم شہرت رکھتا تھا۔ آخر ایک مرتبہ برہمنوں کا یہانتک زور ہو گیا کہ وہ راجہ کو معزول کر دینے پر آمادہ ہو گئے۔

۱۹۔ دریا کے وہ طوفان جن کی نسبت احتمال ہوتا ہے کہ وہ کنارے کے
ان درختوں کو گرا دینگے۔ جن کے نیچے کی زمین عرصہ دراز گذرنے کے
باعث نکل چکی ہوتی ہے۔ اور جنہیں سہارا دینے والی صرف انکی جڑیں
ہوتی ہیں۔ اس کیچڑ کے ذریعہ جو طوفان کے زور سے بہا چلا آتا ہے اس
زمین کو جس پر درخت کھڑا ہوتا ہے۔ مضبوط کر دیتے ہیں۔

یہ شلوک تنگ کے متعلق ہے۔ جو راجہ سنگرام راج کا وزیر تھا۔ اور جس کو راجہ اور اس کا داماد پرین اور راجہ کے تمام برہمن مشیر تنگ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ تنگ کو تنگ کرنے کے لئے جس قدر کوششیں کی جاتی تھیں وہ سب تنگ ہی کے حق میں مفید پڑتی تھیں۔ اسی موقعہ پر کلہن نے جو استعارات تشبیہات اور محاورات کا بادشاہ ہے۔ یہ عجیب وغریب مگر حقیقت آفرین الفاظ استعمال کئے ہیں۔

۲۰۔ ان لوگوں کی شان وشوکت جو ستاروں کی طرح صرف تھوڑی دیر ہی
چمکتے ہیں۔ گرمی کی ایک مختصر رات کی طرح بہت جلد گذر جاتی ہیں۔

یہ فقرہ راجہ ہری راج کے متعلق ہے جو ۲۶ سنہ اور میں صرف ۲۲ دن بے عیب حکومت کرنے کے بعد انتقال کر گیا تھا۔ یہ راجہ غیر متوقع قابلیت کا مالک تھا لیکن آنکھ جھپکنے کے عرصہ میں نہ صرف اس کی حکومت بلکہ زندگی ہی ختم ہو گئی۔ اس کے مرنے پر اہل کشمیر جن کو اس کی چند روزہ حکومت ہی میں وہ آرام نصیب ہو گیا تھا۔ جو بعض راجاؤں کی برسوں کی حکومت میں بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اس شعر کا مصداق تھے۔ ؎

ہم نے راحت بھی اگر پائی تو اک آن کی آن
اخترِ بخت جو چمکا بھی تو جگنو کی طرح

۲۱۔ آدمی خواہ کیسی دور اندیشانہ نگاہ سے سوچ سمجھ کے کام کرتا رہے۔
پھر بھی یہ بہت مشکل ہے۔ کہ باوجود راجہ کا مقبول نظر ہونے کے وہ بے آبروئی
سے بچ سکے۔

یہ فقرہ کھمن نے راجہ اننت (عہد حکومت ۱۰۲۸ء تا ۱۰۶۳ء) کے وزیر اعظم
ہلدر کے زوال سے متعلق لکھا ہے۔ جس کو راجہ نے نہ صرف قید ہی کر دیا۔ بلکہ
اس کا سارا مال و متاع بھی ضبط کر لیا۔ یہ واقعات شخصی حکومتوں
میں بالکل معمولی ہیں۔ اور ان واقعات کی زندہ نظیر ابھی دیسی
ریاستوں میں نظر آجاتی ہے۔ خود جموں و کشمیر ہی میں ابھی بہت سے لوگ
ایسے زندہ موجود ہیں۔ جو اپنے عروج کے زمانہ میں کسی سے بات کرنا
بھی ہتک سمجھتے تھے۔ لیکن جب ان کو زوال آیا۔ تو جو ان کا حشر ہوا
اس کے لئے دعا مانگیے۔ کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ بادشاہوں اور
راجاؤں کی نظر عنایت پر مغرور نہ ہونا چاہئے۔ جہاں تک ہو سکے ملک کی بہتری اور
والئے ملک کی خیر خواہی اور فیاضی و سیر چشمی سے کام لیتے رہنا چاہیے۔

۲۲۔ دنیا میں کون ایسا شخص ہے۔ جو جذبات بد رکھنے والی عورتوں کی نفرت یا
غیر مطمئن استریوں کے شکوہ و شکایت کے باعث موت کا شکار نہیں ہوا۔"

راجہ اننت (عہد حکومت ۱۰۲۸ء تا ۱۰۶۳ء) اپنے نالائق بیٹے
اور اپنی کم فہم رانی کے سلوک ناروا سے تنگ آکر جب خودکشی پر آمادہ

ہوا۔ تو اس نے رانی کو بُلا کر خلوت میں نہایت سخت سست الفاظ کہے اور انہی الفاظ میں وہ الفاظ شامل ہیں۔ جو اوپر لکھے گئے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ راجہ اور بادشاہ کس مزے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن سطحی نظر سے دیکھنے والے لوگ ان کے دلوں کی تہ تک نہیں پہنچتے۔ بڑوں کے غم بھی بڑے ہوتے ہیں۔ اسی لئے ایک شاعر کہتا ہے ؎

خدا سے چاہتے ہم بھی تو تاج زر لیتے
مگر ہوا نہ گوارا یہ بار سر لینا

بادشاہی واقعی بار سر ہے۔ سلطنت کے غم تو الگ رہے۔ بعض وقت تعلقات خانہ داری کے رنج و آلام ہی سے جان پر آ بنتی ہے۔ میاں بیوی اور باپ بیٹے کا وہ رشتہ ہوتا ہے۔ کہ کوئی رشتہ ان سے بڑھ کر محبت کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ لیکن راجہ اننت کے حالات پر نظر دوڑایئے۔ ناخلف بیٹا کلش کئی دفعہ مقابلہ کر چکا ہے۔ رانی اپنی کمزور طبیعت سے راجہ کے لئے وبال جان ہو رہی ہے۔ اور آخر تخت و تاج کا مالک ایک بہت بڑی سلطنت کا حکمران پہلے تارک السلطنت ہوتا۔ اور پھر خودکشی کر کے اپنے آپ کو ہلاک کر دیتا ہے۔ تو یہ بادشاہوں کے معاملات تھے۔ عام آدمیوں میں بھی اکثر ایسے لوگ ہیں جو محض اپنی عورتوں کے بھوہڑپن اور ان کی جہالت و نااہلیت کے باعث اپنے آپ کو بحر مصیبت میں غرق کرتے ہیں۔ سچ ہے ؎

یہ دُنیا اور دُنیا کے یہ جھگڑے عیش جنت ہوں
اگر تقدیر سے مل جاوے دل کی رازداں بی بی

۲۳۔ دغاباز دوست بدزبان عورت۔ متکبر بیٹا مغرورانہ جواب دینے والے نوکر اور
دل جلانے والے ہمراہی ان سب کو معاف کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس سامع کو معاف نہیں کیا
جا سکتا جو حقارت سے اپنی آنکھوں کے کونوں کو ادھر ادھر ہلا کر لاپروائی کا اظہار کرتا ہے۔"

یہ فقرہ پنڈت کلہن نے اس محل پر استعمال کیا ہے۔ جب راجہ اننت کا ناخلف
بیٹا کلش تخت کشمیر پر حکمران تھا اور راجکمار ہرش عالم شہزادگی میں مصیبت کے
دن اس طرح کاٹ رہا تھا۔ کہ ایک گویئے کے طور پر باپ کو عوام کے روبرو
خوش کیا کرتا تھا۔ ایک دن ہرش اسی طرح گا رہا تھا۔ کہ اس کا باپ رفع
حاجت کے بہانہ سے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ ہرش باپ کا یہ سلوک دیکھ کر
عرق شرم سے تر ہو گیا۔ ایک غیور شخص کے لئے واقعی یہ ایسا کام ہے جس سے
اس کے اعزاز میں بہت فرق آ جاتا ہے۔ اکثر لوگوں کی یہ عادت ہے کہ
وہ بعض دفعہ محض اپنی بڑائی اور خودمستی دکھلانے کے لئے ایسے شخص سے
جو ان سے گفتگو کر رہا ہو بڑی لاپروائی کا سلوک کرتے ہیں۔ اور جب
ان کو کبھی اپنی غرض ہوتی ہے۔ تو اپنا تمام اعزاز و تکبر بالائے طاق رکھ
دیتے ہیں۔ سلام روستائی اور حقارت آمیز لاپروائی کلہن کے نزدیک
ایک سخت گناہ ہیں۔ کہ دغابازی۔ بدزبانی۔ غرور۔ گستاخی اور دل آزاری
سب اس کے آگے ہیچ ہیں۔

۲۴۔ راجاؤں کو جان کنی کی حالت میں سب سے بڑی تکلیف اس بات سے
ہوتی ہے کہ جوں جوں موت قریب آتی ہے۔ ان کے اختیارات اس طرح سلب
ہوتے جاتے ہیں جس طرح خواب میں تیزی سے چلنے کی طاقت زائل ہو جاتی ہے۔

راجہ کلش جو اپنی نامناسب حرکات اپنے جور و ستم اور اپنے باپ سے گستاخیوں کی وجہ سے تاریخ کشمیر میں خاص طور پر مشہور ہے۔ اور جو ملک کی بدقسمتی سے ۱۰۶۳ء سے ۱۰۸۹ء تک حکمران رہا ہے۔ جب دم واپسین پر پہنچا۔ تو اسکی حالت اس قدر قابل رحم تھی۔ کہ کوئی نوکر اس کی کسی بات کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھا۔ اس موقعہ پر پنڈت کلہن کہتا ہے کہ وہ عالیشان اور بلند ایوان راجے جو ایک جنبش ابرو سے تیر و تلوار کا کام لیتے تھے جب پائے ہستی کو طے کر کے موت کے کنارے پر آئے۔ تو ایک تو ان کو موت کا غم تھا۔ اور اس سے زیادہ قلق یہ تھا۔ کہ ان کے اختیارات سلب ہو گئے تھے چنانچہ ہندوستان کے عظیم الشان شہنشاہ شاہجہان صاحبقران کے بستر مرگ کا یہ واقعہ مشہور ہے۔ کہ جب آگرہ کے قلعہ میں وہ زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ تو اس کی بڑی بیٹی (روشن آرا) کے سوا کوئی متنفس اسکے پاس نہ تھا

۲۵۔ جس طرح آسمان پر چھوٹے چھوٹے بادل ہاتھیوں، چیتوں، درندوں، گھوڑوں سانپوں اور دوسرے حیوانات کی صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں ایسے ہی لحظہ بلحظہ انسانی دل کے جذبات کی لہریں بھی نرمی و سختی کے درمیان بدلتی رہتی ہیں

راجہ کلش کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا ات کرش تخت پر بیٹھا۔ لیکن باپ کی طرح وہ بھی ایسا سواد تمند تھا۔ کہ جب اس کی تخت نشینی کی رسوم ادا ہو رہی تھیں تو پبلک اپنی ناراضگی اور ناپسندیدگی ظاہر کرنے کے لئے ہر ممکن سے ممکن وسائل عمل میں لا رہی تھی۔ چونکہ رعایا ہرش کو جو اس سے بڑا تھا۔ چاہتی تھی۔ اس لئے کرشن نے اس کو قید خانے میں ڈال دیا۔ اور جلادوں کو

حکم دیا کہ تم ہر وقت اس کے سر پر تیغ برہنہ کی طرح کھڑے رہو اور ایک انگوٹھی دکھا کر یہ کہا۔ کہ اگر یہ انگوٹھی تمہیں بھیجی گئی۔ تو اسے قتل کر دینا۔ اور اگر دوسری بھیجی گئی تو رہا کر دینا۔ جو لوگ قتل کرنے پر امور کئے گئے تھے۔ جب وہ ہرش کے پاس پہنچے تو ایک بھائی کو تخت پر بیٹھے اور ایک کو زندان میں مقید دیکھ کر وہ نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا جس کو نقاش ازل نے محض عبرت وبصیرت کے لئے بنایا ہے۔ ہرش نے اس موقعہ پر وہ الفاظ کہے جو شلوک نمبر ۵ میں درج کئے گئے ہیں جن سے وہ لوگ بہت متاثر ہوئے۔ مگر حکم حاکم مرگ مفاجات سے کوئی چارہ نہ تھا۔

۲۶۔ جس وقت بارش ہونے لگتی ہے۔ تو دھوپ کی گرمی بہت تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔ صبح ہونیکے قریب ہوتی ہے۔ تو رات کی تاریکی بہت گہری ہو جاتی ہے ایسے ہی جب غیر معمولی نیک بختی کسی شخص کے لئے فہم وخیال سے بالا شان وشوکت مہیا کرنیوالی ہو تو وہ ہونیوالی بدنصیبی اپنے مصائب کے زور کو گھٹا دیتی ہے۔

یہ الفاظ بھی ہرش کی اپنی زبان سے نکلے ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ وہ قید خانہ میں تھا۔ اور ہر چند کہ جلاد اس کے سر پر فرشتہ اجل کی طرح موجود تھے۔ پھر بھی وہ ہراساں نہیں تھا۔ اپنے جلادوں کو مختلف نصیحت آمیز بلکہ عبرت انگیز حالات سنا سنا کر وقت ٹال رہا تھا۔ اور باوجودیکہ وہ موت میں گھرا ہوا تھا۔ تاہم اس کو خیال تھا۔ کہ شاید میں کسی تدبیر سے بچ جاؤں اور تخت کشمیر حاصل کر لوں۔ اسی حالت میں جلادوں کے پاس (راجہ کرشن کی غلطی سے) رہا کرنے والی انگوٹھی پہنچ گئی۔ انہوں نے اس کو رہا کر دیا۔ او...

وہ صحیح سلامت نکل کر کرش کے ہلاک کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ اور آخر کرش ابھی ایک سال بھی حکومت کرنے نہ پایا تھا۔ کہ ہرش اس کی جگہ تخت نشین ہو گیا۔ مصیبت اور مشکل کے وقت انسان کو غیر معمولی اضطراب سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ بسا اوقات اس کی رحمت آڑے آجاتی ہے اور تمام مشکلات سے نجات دلاتی ہے ؎

خدا خود میر سامان است ارباب توکّل را
اسی سے لو لگاؤ اور اسی پر آسرا رکھو

۲۷۔ کسی لائق شخص سے اگر کوئی خطا بھی سرزد ہو جائے تو بھی بعض اوقات وہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ جس طرح وہ آگ جو مکان کو جلا دے۔ کھانا پکانے میں بھی مدد دیتی ہے۔"

راجہ ہرش نے ۱۰۸۹ء سے ۱۰۹۲ء تک کشمیر میں حکومت کی۔ انتظامی معاملات کے سلجھانے کے لئے اس نے اپنے بھائی (سابقہ حکمران) کے وزیر نونگ کو جو ہرش کی مخالفت میں بڑا حصہ لیتا تھا۔ ہلاک کر دیا۔ لیکن وقتاً فوقتاً جب پیچیدہ ملکی معاملات میں دقتیں پیدا ہوتیں۔ تو وہ نونگ کو جس کا دماغ ان باتوں میں خوب لڑتا تھا۔ اکثر یاد کیا کرتا تھا۔ اس موقعہ پر کلہن کہتا ہے۔ جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ قابل۔ فراخ حوصلہ اور وفادار شخص سے اگر کسی وقت کوئی غلطی بھی ہو جائے۔ تو اس سے درگذر کرنا لازم ہے۔

۲۸۔ اپنی خوشامدیں سن سن کر راجہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم فوق الفطرت ہیں۔ وہ اس وہم میں پڑ جاتے ہیں کہ اور لوگوں سے ہماری ایک

آنکھ یا دو ہاتھ شائد زیادہ ہیں۔ اور بعض وقت تو ان کو موت کا بھی
خیال نہیں رہتا۔

یہ الفاظ تازیانہ ہیں ان لوگوں کے لئے جو جھوٹی خوشامدوں اور
قصیدہ خوانیوں سے ایک معمولی رئیس کو بہادری میں سکندر اور پہلوانی
میں رستم سخاوت میں حاتم اور فراست میں لقمان و فلاطون سے بھی
بڑھاتے ہیں اور اس میں تکبر اور خود بینی پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ جن
راجاؤں اور رئیسوں کو اپنے نوکروں پر غالب آنے کی قوت حاصل
نہ ہو۔ ان کو سکندر و رستم ظاہر کرنا جو محض ایک بُت کی طرح برائے نام
راجہ ہوں۔ ان کو قیصر و فغفور کا ہم رُتبہ بنانا۔ جس کی سخاوت میں
تعصب اور خود غرضی کا پہلو ہو۔ اس کو حاتم صفت بنانا۔ اور جو مصلحت
اندیشی سے ایسا ہی کورا ہو۔ جیسے اندھیری رات چاندنی سے اس کو لقمان
و فلاطون منش کہنا ایسے لوگوں کا کام ہے۔ جو صرف خوشامد کے ذریعہ
گدایانہ زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ایسے خوشامدی لوگ
راجاؤں سے الگ کر دیئے جائیں۔ اور وہاں ایسے لوگ مقرر کئے جائیں
جو رعایا کی اصلی حالت سے راجہ کو آگاہ کرتے اور اس کے عیوب و
نقائص سے محض ملک کی بہتری کے لئے مودبانہ طور پر اس کو اطلاع
دیتے رہیں۔ تو راجہ بھی اس کے درباری بھی اور اس کا ملک بھی
نیکنام رہے۔

۲۹۔ جس طرح خراب تلوار میدان جنگ میں اپنے ملک کے لئے ہلاکت کا

باعث ہوتی ہے۔ ایسے ہی وہ نوکر نازک وقت میں اپنے آقا پر مصیبت
لاتا ہے۔ جسے بغیر امتحان اور تجربے کے معتبر بنا لیا جاتا ہے؟

یہ بالکل سچ ہے کہ نالائق لوگ جو اپنی چالاکیوں اور کارستانیوں سے راجوں اور بادشاہوں تک رسائی کر لیتے ہیں۔ وہ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ کہ کوئی قابل اور سمجھدار شخص دربار میں گھسنے نہ پائے۔ تاکہ ان کی قابلیت کا پردہ فاش نہ ہو جائے۔ اسی طرح راجہ ہرش کا ایک وزیر تھا۔ راجہ ہرش نے جو ابتدائے عہد حکومت میں پرتاب چکر ورمن (یعنی ساری دنیا کا شاندار حکمران) کہلاتا تھا۔ اس وزیر کے (جو بجائے وزارت کے موت کا مستحق تھا) احمقانہ مشوروں اور اس کی خوشامدانہ تعریفوں سے خوش ہو کر اپنے آپ کو بدچلن۔ ناقابل اور کمزور حکمران بنا دیا۔ اور جب کبھی راجہ پر کوئی مصیبت آتی۔ تو یہ وزیر اس طرح الگ ہو جاتا۔ جیسے مکھن سے بال کو نکال لیتے ہیں۔ اسی طرح کلہن کہتا ہے۔ کہ جو نوکر اعتبار اور راز بتانے کے قابل ہو۔ اس کی طرف سے خوب دلجمعی کر لینی چاہیئے تاکہ وقت پر کسی قسم کا اندیشہ نہ رہے۔

۳۰۔ بزدل کچھوے کے جسم پر اس قسم کی کھال ہوتی ہے جس سے وہ
مصیبت سے محفوظ رہتا ہے۔ لیکن بہادری اور معرکہ کے کام کرنے والا
شیر ہمیشہ غیر محفوظ حالت میں رہ کر جنگل کا بادشاہ کہلا رہا ہے؟

راجہ ہرش کے دوران حکومت میں اوچل کا حملہ کشمیر بہت مشہور تھا۔ آنند نامی ایک شخص راجہ کی طرف سے اوچل کے مقابلہ پر مامور تھا

جب اچل کی کامیابی کے آثار نظر آرہے تھے۔ تو آنند اپنی بہادری اور شجاعت کی ڈینگیں مار کر رعایا اور فوج کا دل بڑھا تا رہا تھا۔ مگر درحقیقت وہ نہایت خوفزدہ تھا۔ بلکہ اس دفعہ اچل کو جلا دینے کا بھی ارادہ کیا۔ لیکن اسے پورا نہ کرسکا۔ اس موقعہ پر پنڈت کلہن نے آنند کی بزدلی اچل کی شجاعت کو کچھوے اور شیر سے نسبت دی ہے۔ بلکہ لکھا ہے کہ قسام ازل کی تقسیم سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ کمینوں کیلئے تو طرفداری کرتا ہے۔ اور بہادروں کے جسم کو ہر طرف سے کمزور بنائے رکھتا ہے

ا۲۱۔ خوش بختی کے زمانہ میں جو شخص دانا اور دلیر اور دیگر اوصاف سے متصف بتایا جاتا ہے بدبختی کے دنوں میں اسی میں ہزاروں

عیب پیدا کر دیئے جاتے ہیں"

ایک مثل مشہور ہے "جس کی کوٹھی میں دانے اس کے کملے بھی سیانے" یعنی جو شخص دولتمند یعنی خوش بخت ہے۔ وہ اگر جاہل بھی ہے۔ تو لوگ اس کے عیبوں کو بھی خوبیاں ظاہر کرتے ہیں اور اگر اس شخص پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے یعنی وہ مفلس و قلاش ہو جائے۔ تو اس کی ہر خوبی اور صفت ایک ناقابل معافی گناہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ الفاظ پنڈت کلہن نے راجہ ہرش کے متعلق لکھے ہیں اور ظاہر کیا ہے۔ کہ جب اس کے زوال کا زمانہ آیا۔ اور جب قسمت نے اپنا رُخ اس سے بدل لیا۔ تو اس کا علم و فضل اس کا جاہ و جلال اور اس کی شجاعت اور جوانمردی سب خاک میں مل گئے۔ خوش قسمتی کی بجلی جس میں دلیری کی گرج موجود تھی۔

اس کے سر پر سے دُور ہو گئی۔ اور آخر وہی لوگ جو اس کے ادنیٰ سے اشارے پر مرنے مارنے کو تیار تھے۔ اس سے کنارہ کشی اختیار کرنے لگے۔

۳۲۔ جو آگ رعایا کی جلتی ہوئی تکلیفوں سے پیدا ہو۔ وہ اس وقت تک نہیں بجھتی۔ جب تک راجہ کی نسل۔ دولت اور زندگی کو تباہ نہ کر دے!

یہ بہت پرانا شلوک ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں گو تک سمرتی اور تنتر مین بجنسہ یا اس کا کسی قدر مفہوم پایا جاتا ہے۔ یہ شلوک بدقسمت راجہ ہرش نے نہایت رنج و حسرت کے ساتھ اس وقت پڑھا تھا۔ جبکہ دشمن نے شاہی محل کو آگ لگا دی تھی اور ڈامر اور دوسرے سنگدل لوگ محلات کی چیزوں کو لوٹ رہے تھے اور ۱۷ رانیاں مع اپنی بہوؤں کے چتا کی نذر ہو رہی تھیں۔ راجہ اپنی سختیوں بے ضابطگیوں اور جبر ستانیوں کا نتیجہ اپنی آنکھ سے دیکھ کر اپنے مظالم کا اقرار کر رہا تھا۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو آغاز سے پہلے ہی انجام کو مدنظر رکھ لیں۔ اور ان دردناک نظاروں سے محفوظ رہیں۔ جو اپنے اعمال و افعال کی بدولت انہیں دیکھنے نصیب ہوتے ہیں۔

۳۳۔ بانسری اس حالت میں کیا آواز دے سکتی ہے۔ جبکہ سب لوگ اس کے مختلف سوراخوں پر انگلیاں رکھ کر اس کو بجانا شروع کر دیں؟

راجہ ہرش اوچل کی ظفریابی بیٹے کی ہراسانی اور اپنی کمزوری و شکستہ دلی کی وجہ سے یہاں تک تباہ حال ہو گیا تھا۔ کہ لوگوں کی نصیحتیں اور مشورے سنتا تھا۔ مگر پریشان خیالی کے باعث کسی ایک پر عمل نہ کر سکتا تھا۔ اس کی ذہنی قابلیت جو بالکل زائل ہو چکی تھی۔ کسی صحیح فیصلہ پر نہ پہنچ سکتی تھی۔ اسی طرح اس مریض کی یا مریض کے تعلقداروں کی کیفیت ہوتی ہے۔ جن کو ایک ہی وقت میں کئی دوائیں اور نسخے بتا دیئے جائیں اور وہ بیچارے ایک سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ کلہن اسی موقعہ پر لکھتا ہے کہ بانسری کے اگر سارے سوراخوں پر انگلیاں رکھ دی جائیں۔ تو اس حالت میں بانسری کیا کام دے سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی مضطرب الحال شخص کو بہت سے مشورے دئے جائیں۔ تو اس غریب کی عقل کسی ایک مشورہ پر بھی عمل کرنے کے قابل نہ ہو سکے گی۔

۴۳۔ جس طرح کمزور معدہ کسی مقوی غذا کو ہضم نہیں کر سکتا۔ اسی طرح چھوٹے اور ہلکے دل والے لوگوں کے لئے خفیہ رازوں کا محفوظ رکھنا بہت مشکل ہے۔

راجہ ہرش جب ایک بھکاری (فقیر) کی جھونپڑی میں پناہ گزین ہو گیا۔ تو بھکاری پہلے تو دو چار دن اس راز کو چھپاتا رہا۔ مگر آخر اس بہت بڑے راز کو جس کا محفوظ رکھنا حوصلے والے آدمیوں کا کام ہے۔ زیادہ دن تک نہ چھپا سکا۔ دشمن کے سپاہی خبر پاتے ہی آ گئے اور سنہ ۱۱۰۱ء میں راجہ اس جھونپڑی میں مارا گیا۔ جس میں لڑائی

کے وقت نہ شیروں جیسے نعرے تھے۔ نہ نقاروں کی آواز تھی اور نہ ہتھیاروں اور نہ تلواروں کی چمک تھی۔ رازدان بننا بہت آسان ہے۔ مگر رازدار بننا بڑے ایثار اور حوصلہ کا کام ہے۔ کمینے اور ناتربیت یافتہ لوگوں پر جو پیٹ کے ہلکے ہوں۔ اور ذاتی طمع کی خاطر لوگوں کو مشکلوں میں پھنسانا۔ بلکہ ان کی جان کا ضائع کرادینا معمولی بات سمجھتے ہوں کبھی اپنے راز ظاہر نہ کرنے چاہئیں۔ ذوق نے سچ کہا ہے ؎

جو پیٹ کے ہلکے ہیں پچے بات کب اُن سے
رد کیں تو اُبھر جائے شکم اور زیادہ

۳۵۔ اہلکار حقیقت میں لوگوں کو مارنے کے خواہش مند بدی کے شائق۔ دوسروں کی جائداد لوٹنے والے بدمعاش اور شیطان ہوتے ہیں۔ اور راجہ کا فرض ہے۔ کہ وہ رعایا کو ان سے محفوظ رکھے۔ لوگوں کو تیزی سے مارنے والے صرف امراض ہیضہ۔ قولنج اور دل کی حرکت بند ہونا ہی نہیں ہے۔ بلکہ اہلکار بھی رعایا کے لئے بمنزلہ طاعون ہوتے ہیں۔ کیکڑا صرف اپنے باپ اور دیمک اپنی ماں کو مارتی ہے لیکن نا پسند اہلکار با اختیار ہو کر ہر شخص کو تباہ کر دیتا ہے؛

اُچل نے راجہ کشمیر ہو کر عہد حکومت ۱۱۰۱ء سے ۱۱۱۱ء سب سے پہلے خائن و بد دیانت اہلکاروں کی خبر لینی شروع کی۔ اور ان کو چن چن کر عبرت انگیز اور مضحکہ خیز سزائیں دیں۔ کیونکہ راجہ ہرش کو زیادہ اس کے اہلکاروں ہی نے محض اپنا پیٹ پالنے اور اس کو بدنام کرنے

کے لئے جبر و تشدد پر آمادہ کیا تھا۔ کلہن نے اپنی راج ترنگنی میں اہلکاروں کو کائیستھ کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ اور لکھا ہے۔ کہ یہ لوگ سلطنت اور رعایا کے حق میں سد سکندری کا کام دیتے ہیں۔ یعنی رعایا کو راجہ سے ملنے نہیں دیتے۔ اور در حقیقت ہے بھی سچ۔ خود غرض اہلکار نہ صرف رعایا کو تباہ کر سکتا ہے۔ بلکہ راجہ کی جڑوں کو بھی کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اس لئے ایسے اہلکاروں کو خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے فوراً نہ صرف اپنے عہدے سے ہٹا دینا چاہیئے۔ بلکہ دوسروں کی عبرت کے لئے وہی سزائیں دینی چاہئیں۔ جو راجہ ادچل نے اپنے خود غرض اہلکاروں کو دی تھیں۔ اور جن کی تفصیل راج ترنگنی[1] میں موجود ہے۔ ان واقعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں جس کو ۹۰۰ سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ ہندوستان اور بالخصوص کشمیر میں ہیضہ اور طاعون کا وجود بھی پایا جاتا تھا۔

۳۶۔ ندیاں جس پانی کو سمندر تک لے جاتی ہیں۔ وہ سورج کی تابش سے بخارات بن کر اڑ جانے کے بعد بادلوں کے ذریعہ دوبارہ حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن جو چیز ایک دفعہ کسی سوداگر (ساہوکار) کے ہاں جمع کرا دی جائے۔ وہ کبھی واپس نہیں مل سکتی۔

جو ساہوکار اپنی پیشانی۔ آنکھوں۔ کانوں۔ چھاتی اور بازوؤں

---

[1] دیکھو مکمل راج ترنگنی جلد دوم صفحہ ۱۵ الغایت ۱۷ مولفہ مترجمہ ٹھاکر اچھر چند شاہپوریہ

پر صندل کے ٹیکے لگاتا ہے۔ وہ ہر ایک لمحہ میں اس خطرناک بچھو کی
طرح ایک شخص کی جان لے سکتا ہے۔ جو اپنے چھ نشانوں سے
دوڑتا پھرتا ہے۔ فاحشہ عورتیں اہلکار کچہریوں کے محرر اور ساہوکار
یا سوداگر فطرتاً دغاباز ہوتے ہیں۔ اور زہریلے تیروں پر بھی
فوقیت رکھتے ہیں۔

راجہ اوچل کے عہد میں ایک مالدار شخص ایک لاکھ دینار کی رقم ایک
ساہوکار کے پاس رکھ کر کچھ عرصہ کے لئے کہیں باہر چلا گیا۔ واپس آنے
پر اس نے اپنا روپیہ طلب کیا۔ تو ساہوکار نے ایک عجیب و غریب
حساب[1] کے ذریعہ اس کا سارا گھر پورا کر دیا۔ آخر مقدمہ ہوا۔ ماتحت
عدالتیں کچھ فیصلہ نہ کر سکیں۔ جب راجہ کے روبرو یہ مقدمہ پیش
ہوا۔ تو اس نے اپنی مشہور دانائی اور ذہانت سے بال کی کھال
نکال لی۔ اور روپیہ سوداگر سے واپس دلوا دیا۔ سوداگر کے
واقعہ اور راجہ کے فیصلہ کو قریباً ۹۰۰ سال گذر چکے ہیں لیکن افسوس
ہے کہ ملک کی بدقسمتی سے ابھی تک بہت سے خائن و بددیانت
بلکہ غاصب لوگ موجود ہیں۔ جو بگلا بھگت بن کر اپنے آپ کو دیانتدار
مشہور کر کے یتیموں۔ بیواؤں کے ولی یا سرپرست کہلا کر گلچھرے
اڑا رہے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کا تو شمار ہی کیا۔ جو امانت لے کر

---

[1] دیکھو صفحہ ۲۳ تا ۲۵ کمل راج ترنگنی جلد دوم مولف ٹھاکر اچھر چند صاحب

دینے کا نام ہی نہیں جانتے۔ بلکہ اس زمانہ میں تو یہانتک نوبت آچکی ہے
کہ رجسٹریاں ہوتی ہیں۔ اسٹامپ لکھے جاتے ہیں۔ اور چالاک اور
بے ایمان لوگ پھر بھی دینے سے انکار کر جاتے ہیں۔ دیہات میں جہاں
لوگ بنکوں اور ڈاکخانوں سے فائدہ اٹھانا نہیں جانتے۔ ابھی تک اکثر
لوگ اپنا روپیہ ساہوکاروں کے پاس رکھ دیتے ہیں۔ لیکن بسا اوقات
ایسا ہوتا ہے۔ کہ اول تو ان کے خود طلب کرتے ہی بدقت ملتا ہے اور
اگر بدقسمتی سے ان کا انتقال ہو جائے۔ تو بالکل صفائی ہے۔

۳۷۔ دولت کی دیوی جس نے ایک فاحشہ عورت کی مانند سحر آمیز
غازہ لگایا ہوا ہو۔ مضبوط دل لوگوں کو بھی مطیع کر لیتی ہے۔ اور ان
کو ایسے کام پر مجبور کرتی ہے۔ جو انسانیت۔ شرافت اور حد اعتدال
سے بعید ہوں؛

دولت حاصل کر کے اپنے آپ کو برقرار رکھنا بہت مشکل ہے بعض
لوگ جو کسی کمینہ اور جاہل نسل سے ہوتے ہیں۔ جب کبھی اتفاق سے
دولت مند ہو جاتے ہیں۔ تو اپنے آپ کو امیر بلکہ امیر الامرا ظاہر کرنے
کے لئے بہت اوچھے ہتھیاروں سے کام لیتے ہیں۔ اور اپنے گرد وپیش
اپنی دولتمندی ظاہر کرنے کی کئی کئی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں۔ اور بعض
دفعہ اس ناپائدار دولت کے گھمنڈ میں اپنے بڑوں کا ادب تک تو
کجا ان سے تعلق پیدا کرنا بھی باعث ہتک سمجھتے ہیں۔ ایسی دولت
فی الواقع ایک فاحشہ عورت کی مانند ہے۔ جو آج کسی کے پاس ہے

اور کل کسی کے پاس۔ اس کی محبت پر اعتبار کر لینا۔ اور اس کے بھروسے
ہر ایک پر رعب جمانا اور بدتمیزی سے پیش آنا سراسر حماقت ہے۔

۳۸۔ جس طرح پہاڑ کی غار سے نکلی ہوئی ہوا میدان میں پہنچکر بہت
جلد چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ اُسی طرح بری خبر بھی ہوا کی طرح
اُڑتی اور بہت جلد اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔

یہ فقرہ جس کی صداقت میں کوئی کلام نہیں۔ پنڈت کلہن نے
اس موقعہ پر استعمال کیا ہے۔ جب راجہ اوچل کامراج (علاقہ زینہ گیر کھیل
ادتر مچھی پورہ وغیرہ) کے دورہ پر تھا۔ موضع کبلی تیپور (موجودہ نام کرم بہرجو
دامن کوہ میں واقع ہے) کے چنڈالوں کی مسلح جماعت نے اس پر حملہ
کر دیا۔ گو اس نے بڑی پھرتی سے اس حملہ سے بچ کر رات ایک کھڈ میں
بسر کی۔ مگر اس کے قتل ہونے کی خبر تمام کشمیر میں بجلی کی طرح پھیل گئی
یہاں تک کہ ملک میں سخت شورش پیدا ہو گئی۔ بُری افواہ بہت جلد
پھیل جاتی ہے۔ اور اس سے بعض وقت نہایت خطرناک نتائج ظہور
میں آتے ہیں۔

۳۹۔ جس طرح موسم گرما کے آخری ایام میں سونے والا گہری نیند
میں غافل ہو کر اپنے آپ کو بھلا دیتا ہے۔ اور جگانے والے
سے ناراض ہوتا ہے۔ ایسے ہی وہ شخص جو اپنے آپ کو قسمت پر
چھوڑ دیتا ہے۔ ان لوگوں سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ جو اس کے
اندر تحریک پیدا کرتے ہیں"

کلہن کو جس قدر استعارات اور محاورات میں مشق اور تجربہ ہے۔ اور جس خوبصورتی اور موزونیت سے وہ ان تشبیہات کو استعمال میں لاتا ہے۔ بہت کم مورخ اس کا مقابلہ کر سکے ہیں۔ موسم گرما میں غضب کی گہری نیند آتی ہے۔ انسان واقعی غافل ہو کر سو جاتا ہے۔ اور خواب سے بیدار کرنے والے پر ناراض ہوتا ہے۔ کلہن نے اس مثال کو راجہ اوچل کی اس خودمستی سے منسوب کیا ہے۔ جب وہ اہلکاروں اور امیروں۔ وزیروں پر حد سے زیادہ سختیاں کر کے پھر ان کو بحال کر دیتا تھا۔ اور ان کے اندرونی انتقام اور خفیہ سازشوں سے بے خبر رہتا تھا۔ اسی طرح اس نے اپنے کمانڈر انچیف بھوگ سین کو موقوف کر دیا۔ لیکن اس کی بے عزتی کر کے پھر اُسے واپس بُلوا لیا۔ اور حاضر باشوں میں رکھ لیا۔ بھوگ سین نے ایک دن راجہ سے کہا کہ میں خلوت میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ راجہ نے حقارت سے جواب دیا۔ اب تمہیں تمہارا عہدہ نہیں واپس مل سکتا۔ اس کے سوا اور کیا کہنا چاہتے ہو۔ بھوگ سین دل برداشتہ ہو کر باغیوں کی خفیہ انجمن میں جا ملا۔ اور آخر راجہ اوچل ایسی ہی خفیہ انجمنوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا۔ اوچل اگر نخوت و خودمستی کا نشہ اُتار کر بھوگ سین کی بات سن لیتا۔ جو سازش کا راز ظاہر کرنے سے متعلق تھی تو یقیناً اس کی جان بچ جاتی۔ مگر اس نے ناصح مشفق کی بات نہ سُنی اور جان گنوا بیٹھا۔ اسی طرح ایک زمانہ میں ڈاکٹر سر سید احمد خاں

بہادر ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی ترویج کے زبردست حامی تھے
اور مسلمانوں کو اس خواب سے بیدار کرنا چاہتے تھے۔ جس میں وہ
برسوں سے مدہوش تھے۔ لیکن ہمارے علمانے ان پر کفر کے فتوے
لگائے۔ اور ان پر بہت ناراضگی ظاہر کی۔ مگر اب نہ صرف عوام بلکہ
طبقہ علمائیں بھی انگریزی تعلیم کو زندگی اور کامیابی کا ضروری جزو
خیال کیا جاتا ہے۔ کشمیر میں بھی میر واعظ ثانی مولوی رسول شاہ مرحوم
سرسید سے کم درجہ نہیں رکھتے تھے۔ وہ انگریزی تعلیم کے زبردست
حامی تھے۔ مگر فرقہ پیرزادگان نے نہ صرف انگریزی بلکہ اردو تک
کے پڑھنے کی مخالفت کی جس کا نتیجہ اب وہ بھگت رہے ہیں
مگر ایک زمانہ آئے گا۔ کہ پیر صاحبان نہ صرف حصول تعلیم کے وعظ
کیا کریں گے۔ بلکہ اپنی اولاد کو بھی زمانہ کے مروجہ علوم سے آگاہ کرینگے۔

۵۱ ۔ ہر ایک بڑے آدمی پر انجام کار کوئی نہ کوئی ایسی مصیبت نازل
ہوتی ہے۔ گویا وہ بالکل معمولی حیثیت کا انسان ہے۔ اس صورت میں
کون ہے۔ جو کہہ سکے ۔
کہ میں بڑا ہوں"

یہ دردناک الفاظ راجہ ادچل کی موت پر کہے گئے ہیں۔ یہ موت
اس جلیل القدر آدمی کی تھی۔ جو مرنے سے پہلے کشمیر کے تخت و تاج کا
وارث تھا۔ اور جو مرنے کے بعد ایسی بیکسی کی حالت میں تھا۔ کہ
لوگ اس کی لاش کو گھسیٹتے ہوئے اس حیثیت سے ہیں کہ اس کی گردن

لٹک رہی تھی۔ اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ مرگھٹ کی طرف لیجا رہے تھے۔ کبریائی اسی ذات پاک کو زیبا ہے جو سب سے بڑا اکبر ہے۔ بڑائی کے وہی قابل ہے جو فی الحقیقت سب سے بڑا ہے۔ انسان جس کی اصل ایک ناپاک قطرہ سے شروع ہوتی ہے۔ اس عظیم الشان دعوی کا کس طرح مرتکب ہو سکتا ہے۔ اور اگر ہو بھی تو عزازیل کی طرح بزندان لعنت گرفتار رہو۔ بڑا آدمی وہی ہے۔ جو بڑا ہو کر اپنے آپ کو چھوٹا تصور کرتا ہے۔ بقول امیر مینائی ؎

سمجھتا ہے جو آپ کو سب سے چھوٹا
وہی فی الحقیقت بڑا آدمی ہے

الم۔ کوئی شخص عورتوں کے دلوں کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ جن کی زلفوں میں خم آنکھوں میں مستی۔ اور ابھری ہوئی چھاتیوں میں سختی نمودار ہوتی ہے۔ کئی عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ بے وفائی کرنے کے باوجود بظاہر نہایت خوشی سے ستی ہو جاتی ہیں۔

کلہن کا یہ اشارہ راجہ اوچل کی رانی جے متی کی طرف ہے جو بظاہر ستی ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اور اسی لئے اس نے بہت سا روپیہ رشوت میں خرچ کیا۔ مگر اسکی یہ مراد پوری نہ ہو سکی۔ اور آخر اس کے لئے چتا تیار کر دی گئی۔ کلہن لکھتا ہے۔ چتا تیار ہونے اور آگ کے شعلے بلند ہونے پر رانی اس جوش اور شوق سے چتا میں کود دی۔ جیسے وہ پہلے ہی اس کے لئے تیار تھی۔

واقعی عورت کی فطرت کے متعلق کسی کو یقین نہیں ہو سکتا
تریا چرتر مشہور ہے۔

الہم۔ جب تک کسی شخص کی موت نہ آئے۔ بجلی کی خوفناک کڑک بھی
اس کو ہلاک نہیں کر سکتی۔ لیکن جب اس کا وقت پورا ہو جائے
تو ممکن ہے۔ ایک پھول کے صدمہ ہی سے اس کی موت واقع
ہو جائے!

راجہ سسل (عہد حکومت ۱۱۱۲ء یا ۱۱۲۰ء) ایک روز
دشمنوں کے نرغہ میں آگیا۔ اس کے چند ہمراہی مارے گئے۔
لیکن یہ زخمی ہو کر بچ نکلا۔ بلکہ اس نے باغیوں کو عبرت ناک
سزائیں دیں۔ اس موقعہ پر کلہن نے یہ فقرہ استعمال کیا ہے جس
کا خلاصہ یہ ہے کہ "جسے خدا رکھے اسے کون مارے"! خدا کی
حکمتوں کو کون جان سکتا ہے۔ اور اس کی بارگاہ عالی میں
کس کو دم مارنے کی طاقت ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ انسان چلتی
گاڑی سے گر پڑا۔ مکان کے نیچے دب گیا۔ اور شیر کے منہ میں
آگیا ہے۔ لیکن اس حافظ حقیقی نے جو انسان و حیوان سے لیکر
پتھر کے اندر رہنے والے کیڑوں تک کا محافظ ہے۔ اپنی قدرت کاملہ سے
اس کو بچا لیا ہے۔ مگر جب وقت پورا ہو گیا ہے۔ تو یہی انسان
چلتے چلتے دل کی حرکت بند ہو جانے۔ خربوزہ کے چھلکے سے پاؤں
پھسل جانے۔ اور بعض دفعہ معمولی سی چوٹ لگ جانے سے فنا

ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ے

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں داناکروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا۔ تو یار! آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

۳ لہ۔ گاؤں سے گیدڑ کو شیر سے بھٹ کے قریب پہنچ کر اپنی بہادری ظاہر کرنے کا اس سے بہتر موقعہ کون سا مل سکتا ہے۔ کہ جب شیر ہاتھی کے ساتھ لڑائی میں مصروف ہو؟

راجہ سسل جب تکلیفات میں مبتلا تھا۔ اور ملک میں خوفناک قتل ترقی پر تھا۔ ایک شخص نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر (بزدلوں کی طرح) بعض دیہات کو لوٹ لیا۔ کلہن نے اس موقعہ پر گیدڑ کی بہادری اور شیر کی مصروفیت کی بہت عمدہ مثال پیش کی ہے۔ جب مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ تو اکثر کمینے لوگ انقلاب زمانہ کی طرح آنکھیں بدل لیتے ہیں۔ اور جن کو کبھی سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ وہ مقابلہ پر تیار ہو جاتے ہیں۔ آخر گیدڑ گیدڑ ہے اور شیر شیر ہے۔ شیر کی ایک ہی گرج سے گیدڑ کے بدن پر لرزہ آ جاتا ہے۔

لہ لہ۔ لوگ دولت میں اندھے ہو کر اس بات کو بالکل بھلا دیتے ہیں کہ وہ جسم جس کی خاطر وہ ڈرتے کہ جسم (یعنی عاقبت) کی تمام خوشیوں کو مٹا دیتے ہیں۔ کیسی جلدی فنا ہو جانے والا ہے۔

راجہ سسل کی دوبارہ تخت نشینی (سنہ ۱۱۲۱ء سے سنہ ۱۱۲۸ء تک) کے دوران میں جنگ راج نامی ایک عہدہ دار نے اپنے ظلم و ستم کی وجہ

سے اپنے آپ کو دوزخ کا صحیح مستحق قرار دے لیا تھا۔ وہ بہت جلد
عین عالم شباب میں مر گیا۔ اس کی جبر ستانیوں کو یاد کر کے پنڈت
کلہن کہتا ہے۔ کہ اکثر لوگ دولت کے نشہ میں اپنی عاقبت کو تباہ کر
لیتے ہیں اور اپنے بل اور اپنی مایا کے غرور میں اپنے ہی جنس (یعنی انسانوں
کی) پر کام سے بے حقیقت سمجھتے ہیں۔ پنڈت کلہن کہتا ہے غافلو! چار
دن کی زندگی میں یہ کیا اندھیر مچا رکھا ہے۔ جس جسم کو آرام دینے کے
لئے دوسروں کو بے آرام کرتے ہو۔ اپنی ہستی پر غور کرو۔ فانی چیزوں
کے لئے اتنے مٹے جاتے ہو۔ اور دوسروں کو مٹاتے جاتے ہو۔ آخر اس
ابتدا کی کوئی انتہا بھی ہے ۵

جس ستمگر نے مجھے قتل کیا تھا اے فوق
حشر تک وہ بھی تو زندہ نہ رہا میرے بعد

۵لم۔ خطرہ یا مصیبت کے یکایک نازل ہونے ہی سے انسان خائف ہو جاتا ہے۔ لیکن
جب وہ اس خطرہ یا مصیبت میں پڑ جائے اور اس کا عادی ہو جائے۔ تو پھر وہ
خوف دور ہو جاتا ہے۔ اسی مضمون کو مرزا غالب نے انیسویں صدی انگریزی
کے وسط میں ذیل کے شعر میں ظاہر کیا تھا۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اسی مضمون کو بارہویں صدی انگریزی کے شروع میں پنڈت کلہن
نے جس خوبی عمدگی اور صفائی سے ادا کیا ہے مرزا غالب کے شعر کی طرح

اس کو بھی خراج تحسین دیئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔ یہ الفاظ پنڈت کلہن نے راجہ سسیل کے متعلق لکھے ہیں۔ کہ جب کوئی مصیبت اس پر نازل ہوتی تھی۔ تو وہ ابتدا میں ہراساں ہو جاتا تھا۔ لیکن چند ہی دنوں کے بعد اس قدر استقلال دکھاتا تھا۔ کہ جہاں چاہتا تھا بلا اضطراب چلا جاتا تھا۔ انسان جب پانی میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ تو پہلے یہ سرد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب اس میں غوطہ لگاؤ۔ تو پھر سردی کا چنداں اثر نہیں رہتا۔ یہی حال مشکلات و تکلیفات کا ہے۔ اگر استقلال و ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ اور دل پر بے فائدہ غم نہ لگایا جائے۔ تو صحت بھی برقرار رہتی ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کامیابی عطا کر دیتا ہے۔ اور اگر ہمت ہار کر بیٹھ جائیں۔ تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ صحت رہے گی۔ اور نہ کبھی کامیابی نصیب ہوگی۔

۴۶۔ وہ تخت قابل نفرین ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے باپ بیٹے ایک دوسرے پر اعتبار نہیں کرتے۔ اور نہ دن کو چین اور نہ رات کو آرام لے سکتے ہیں۔

راجہ لوگ جب بیویوں۔ بیٹوں۔ بھائیوں اور نوکروں تک کا اعتبار نہیں کرتے۔ تو کون اپنے آپ کو راجہ کا نہایت ہی معتبر کہنے کا مستحق ہو سکتا ہے"

راجہ سسیل نے اپنے بیٹے راجکمار جے سنگھ کو (جس کے عہد میں پنڈت کلہن نے اپنی تاریخ مرتب کی ہے) جب دھوکا اور فریب سے قید کرنے کا ارادہ کیا۔ اور جب باپ بیٹوں میں تخت کے لئے سخت مخالفانہ

جدوجہد ہو رہی تھی۔ اس وقت پنڈت کلہن نے مذکورہ بالا اشلوک اپنی تاریخ میں درج کیا۔ اور اس تخت و تاج کو دھتکار بتائی۔ جس نے باپ بیٹے جیسے عزیز رشتے میں مغائرت و عداوت پیدا کر دی یہی حال اورنگ زیب اور شاہ جہان بادشاہ کا ہوا۔ فرق صرف یہ تھا کہ سسیل اپنے بھائی اوچل کو مارنے کے بعد بیٹے کے قید کرنے کی فکر میں تھا۔ اور اورنگ زیب نے بھائیوں کو قتل کرنے کے بعد باپ کو قید خانہ میں ڈال دیا تھا۔ فی الواقعہ راجوں اور بادشاہوں کی زندگیاں دنیا کا نشیب و فراز اور عبرت آموزی کی ایک دلکش داستان ہوتی ہیں۔ عزیز سے عزیز رشتہ بھی (جو بیوی اور بیٹوں اور بھائیوں کا ہے) قابل اعتبار نہیں سمجھا جاتا۔ اور زندگی آخر انہی توہمات کی نذر ہو جاتی ہے۔

۷ لم۔ کھیت میں تنکوں کا آدمی بنا کر کھڑا کر دیا اور اس کا منہ آگ سے جھلس دیا جاتا ہے۔ اور وہ چڑیوں، درندوں کو ڈرا کر چاولوں کی فصلوں کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ مگر جنگلی درختوں کی حفاظت پر اگر اس کو مقرر کر دیا جائے۔ تو وہ تباہ کن جنگلی ہاتھیوں کی دستبرد سے انہیں بچانے کے متعلق کیا کر سکے گا؟

راجہ جے سنگھ کے عہد (۱۱۲۸ء سے ۱۱۴۹ء م) تک بھکشو اور بعض امرا اور ڈامروں اور راجہ سومپال والئے راجپوری (راجوری) کی سازشیں بہت مشہور رہیں۔ ایک دفعہ ڈامروں نے راجہ سومپال سے ساتھ سازش کر کے اس کو اس امید پر تخت کشمیر دلانا چاہا کہ

چونکہ تخت اس کو ہمارے ذریعہ حاصل ہوگا۔ اس لئے ہم جس طرح
چاہیں گے حکومت کریں گے۔ راجہ سومپال بوجہ اپنی کمزوریوں کے
تخت کشمیر کے قابل نہ تھا۔ اس لئے اس موقعہ پر کلہن لکھتا ہے
کہ آیا ایک ایسا شخص جو غلام ہونے کے قابل بھی نہیں تخت پر
بیٹھ کر خداوند نعمت کا اعزاز حاصل کر سکتا ہے۔ گدھے کو اگر شیر کی
کھال پہنا دی جائے۔ پھر بھی اس کا گدھا پن کسی نہ کسی طرح ضرور
ظاہر ہو جاتا ہے۔ سومپال جو راجوری کی چھوٹی سی حکومت پر
بمشکل حکومت کر سکتا تھا۔ وہ کشمیر کی عظیم طاقت کس طرح
سنبھال سکتا تھا۔ ایاز قدر خود شناس کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے

۸۴۔ ایسا کون شخص ہے۔ جو شیر کی ایال سانپ کے من۔ آگ کے
شعلے یا غیور شوہر کے جیتے جی اس کی بیوی کو ہاتھ لگا سکے؟

جنگ دامودر کے بعد جب بھکشو کامل طور پر تباہ ہو چکا
تو ایک شخص کو شتمی شور نامی جو ایک فاحشہ عورت کا بیٹا تھا
اس بدقسمت شاہزادہ کی رانیوں کو اپنے قبضہ میں لانیکی کوشش
کرنے لگا۔ اور آخر ناکام رہا۔ اس موقعہ پر کلہن نے لکھا ہے
کہ جس طرح شیر کی ایال کو وہی شخص ہاتھ لگا سکتا ہے۔ جس کا
موت انتظار کر رہی ہو۔ یا سانپ کے من کو وہی شخص چھیڑ
سکتا ہے۔ جس کو اپنی موت کی پروا نہ ہو۔ آگ کے شعلوں سے
وہی شخص کھیل سکتا ہے۔ جو جل مرنے کے لئے تیار ہو۔ اسی طرح

کسی غیور شوہر کی پاکدامن بیوی کو داغ لگانا جان جوکھوں کا کام ہے۔

۴۹۔ جب کنول کے پھولوں کی قطار پانی کی سطح سے اونچی ہو جائے تو اس کے لئے یہ امر موجب ندامت ہے۔ کہ اس پر سے مینڈک پھدکتے ہوئے گذرتے ہیں:

کلہن نے اس فقرہ سے مطلب یہ نکالا ہے کہ راجہ جب با اختیار ہو جائے۔ تو مناسب یہ ہے۔ کہ وہ اپنے اقتدار اور درجہ کا خیال رکھے۔ اور ان لوگوں کے ساتھ جن سے وہ بے تکلفی کا برتاؤ کرتا تھا۔ متانت اور سنجیدگی اختیار کرلے۔ تاکہ وہ ادب اور احترام جو اس کے اوتار اور ظل اللہ ہونے میں ہے زائل نہ ہونے پائے۔ اور اس کا رعب داب (جس کی انتظام ملک کے لئے بے حد ضرورت ہے) قائم رہے۔

۵۰۔ جب لوگ دروپدی کے بالوں سے گھسیٹے جانے کی کیفیت سنتے ہیں۔ تو دہرت راشٹر کے بیٹوں (پانڈوں) کی نسبت ان کا غصہ بہت تیز ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ کوروؤں کے ہو بیٹے جانے اور دریودھن کے سر کچلے جانے کا ذکر سنتے ہیں۔ تو وہی لوگ پانڈوں کے خلاف خشمناک ہو جاتے ہیں:

جب راجہ جے سنگھ نے ۱۱۱۱ سنہ میں ملارجن کو زخمی کرکے

قیدخانہ میں ڈال دیا۔ تو اکثر لوگ راجہ پر لعن طعن کرتے تھے
مگر جب ملارجن کی بغاوت انگیز کارروائیوں کا ذکر سنتے تھے۔ تو
ندامت آمیز خاموشی اختیار کر لیتے تھے۔ اسی موقعہ پر مشہور زمتہ رس
کلہن لکھتا ہے۔ کہ دراصل معاملات کی وجوہ اور ان کے نتائج کو
سوائے ان لوگوں کے جو ان میں شریک ہوں۔ یا جنہوں نے واقعات
کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ اور کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ اس لئے
طرفین کے حالات جب تک معلوم نہ ہوں۔ اپنی رائے کو محفوظ رکھنا
چاہیئے۔ کیونکہ جلد بازی کی رائے میں عموماً تبدیلی کی ضرورت
واقع ہوتی ہے۔

۵۱۔ صندل کا درخت جلتا ہوا بھی اس شخص کو فرحت دیتا ہے جس
نے جنگل میں آگ لگا دی ہو۔

کلہن نے یہ الفاظ راجہ جے سنگھ کی نیک صفات و عادات
کے متعلق بیان کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ جے سنگھ ایسا نیک دل راجہ
تھا کہ اگر دشمن اسے تکلیف بھی دیتا۔ تو وہ اپنی کامل بردباری (روشنی
طبع) سے اس کے تاریک دل کو منور کرنے میں بخل نہ کرتا تھا۔ صندل
کے درخت کا قاعدہ ہے کہ اگر اس کو آگ لگا دی جائے۔ تو بھی وہ
اپنی خوشبو دینے سے نہیں رکتا۔ واقعی جو لوگ ازلی سعید اور قدرتی چشمہ
کی طرح ہیں۔ وہ اپنا فیض پہنچانے سے کبھی دریغ نہیں کرتے۔

۵۲۔ اگر ہاتھی کنول کے پھولوں سے خوف کیا جائے تو ممکن ہے

یہ مجھ پر شہد کی مکھیاں ریا اپنے تیر) چھوڑ دے۔ اپنے پتول (رسول پر سامان اسلحہ لادے ہوئے) کے ذریعہ حملہ آور ہو۔ اور اپنے ریشوں ریاز نجیروں) کے ذریعہ مجھے جکڑ دے۔ تو اس صورت میں ہاتھی باوجود بڑے بڑے اعضاء رکھنے کے ممکن ہے۔ اس کے اکھاڑنے سے قاصر رہے!

اگر کوئی دشمن کی طاقت کی افواہیں سن کر بے حواس ہو جائے اور بجائے دشمن کو تباہ کرنے کے اپنے ہی تفکرات میں تباہ ہو جائے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اس لئے جسمانی طاقت سے من (دل) کی طاقت زیادہ کارآمد ہو سکتی ہے۔ جب دل کمزور ہے۔ اندر کھوکھلا ہے۔ تو تمہاری فربہی کس کام آسکتی ہے۔

۵۳۔ متواتر حرکت کرتے رہنے سے ہوا بھی گرم ہو جاتی ہے۔ اور پانی دوامی رگڑ کے ذریعہ بڑے بڑے پہاڑوں کو بھی ضائع کر دیتا ہے!

۱۱۴۲ء میں جب راجہ جے سنگھ کے بعض وزیر قلعہ شراشلا کے محاصرہ سے مایوس ہو کر اس کو دشمن سے صلح کرنے کی صلاح دے رہے تھے۔ تو اس نے انہیں سختی سے محاصرہ کرنے کا حکم دیا۔ اور جوش بھرے الفاظ کہے دوران میں وہ الفاظ کہے۔ جو نمبر ۵۲ میں درج کئے گئے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر

کسی کام کو استقلال کے ساتھ کیا جائے۔ تو گو اس سے انسان درجہ تکمیل تک نہ پہنچے۔ تاہم غیر متوقع اہمیت سے نتائج ظہور میں ضرور آجاتے ہیں۔ اس لئے ہمت مردانہ سے کام لے کر ہر کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرو۔ شہد کی مکھیاں اور دیمک کے کیڑے لگاتار محنت اور جگر کاوی سے ایسے محفوظ مکان بنا لیتے ہیں۔ کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے اپنے تمام عقلی و ذہنی ذخائر سے کام لے کر ان کے گھروں کا ادنیٰ سا نمونہ بھی تیار نہیں کر سکتا۔ پس سبق سیکھنا چاہیئے۔ ایسی باتوں اور نظیروں سے ؎

کامیابی کے لئے ہمّت ہے شرط
آگے جو اللہ کو منظور ہے

۵۴۔ میدان جنگ کی موت ویسی ہی خوشگوار ہوتی ہے۔ جیسے کسی حسین عورت کے وصل کی آرزو۔"

ہر شخص موت سے ڈرتا ہے۔ لیکن وہ سپاہی جو دشمن کی فوج کے مقابلہ پر ہے۔ صاف لفظوں میں کہتا ہے ع

موت کے منہ میں جا رہا ہوں میں

روتے ہوئے خویش و اقارب کو دیکھ کر نہ اس کا دل گھٹتا۔ اور نہ لاشوں کا انبار دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹتا ہے۔ اس کا دل جوش و خروش اور امنگوں کے ایک بہتے ہوئے دریا کی مانند ہے۔ جس میں

وہ تعلقات دنیوی کو خس وخاشاک کی طرح بہا دیتا ہے۔ نہ اس کو لاش کے بے گور و کفن ہونے کا فکر ہے۔ نہ یہ غم ہوتا ہے کہ میری موت کے بعد میرے بچے اور بیوی کیا کریں گے۔ اور کہاں سے کھائیں گے۔ غرض یہ موت ایسی خوشگوار ہوتی ہے۔ جیسے اس محبوبہ دلنواز کے وصال کی آرزو جس کی ملاقات کے انتظار میں چشم منتظر کو برسوں سے برسوں گزر گئے ہوں۔ اور اسی لئے بادشاہ کے جاں نثاروں۔ ملک کے بہی خواہوں۔ قوم پرستوں اور جانباز سپاہیوں کا قول ہے ؎

آں نہ من باشم کہ روزے جنگ بینی پشت من
ایں منم کاندر میانِ خاک وخوں بینی سرے

۵۵۔ حقیقی شاعروں کی وہ غیر معمولی طاقت (قابلیت وذہانت) واقعی تحسین کی مستحق ہے۔ جو اپنی غیر فانی شہرت کے علاوہ دوسروں کو بھی بقائے دوام کا خلعت پہناتی ہے۔ اور اس لئے وہ ذہانت امرت کی ندی پر بھی فوقیت رکھتی ہے سوائے شاعروں کے اور کون ہے۔ جو زمانہ ماضی کے دلفریب کارناموں کو لوگوں کی نظروں کے سامنے لا سکتا ہے!

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان کی شاعری کسی زمانہ میں امرت کی ندی پر بھی فوقیت رکھتی تھی۔ اور اس کی

بین مثال پنڈت کلہن کی راج ترنگنی ہمارے سامنے موجود ہے
جس کی تصنیف کا زمانہ ۹۰۰ سال کے عرصہ سے بھی زیادہ کا
ہے۔ اور جس کو تمام انگریزی موٴرخوں نے ہندوستان قدیم کا
بہترین شاعر اور موٴرخ تسلیم کیا ہے۔ اس شاعر میں جو فطرت
پرست ہے۔ اور جو ہر ذرہ میں آفتاب کی جھلک دیکھتا ہے۔ قدرت
نے وہ طاقت پیدا کی ہے۔ کہ وہ نہ صرف زمانہ ماضی کے دلفریب
کارنامے ہی ہم کو دکھا سکتا ہے۔ بلکہ زمانہ کے واقعات پر اپنی دوربین
نظر دوڑا کر وہ حالات بھی ہم کو بتا سکتا ہے۔ جن کی نسبت ہمیں
خیال تک بھی نہیں آتا۔ اور کمال یہ ہے کہ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

کہکر ہم کو اور بھی اُلجھنوں میں پھنسا دیتا ہے۔ قوموں اور
ملکوں پر کئی دور آئے اور چلے گئے۔ اسی طرح شاعری نے بھی
پلٹے کھائے ہیں۔ زوال سلطنت دہلی کے زمانہ میں شاعری اپنے
کمال پر تھی۔ غدر کے بعد جب ہندوستان کی کایا پلٹ ہو گئی
تو شاعری نے بھی کروٹ بدلی۔ اور اب تو قریبا ہر شاعر قومی
شاعر ملکی شاعر اور نیچرل شاعر نظر آتا ہے۔ اور خط و خال اور
گل و بلبل کے تھوڑے بہت شیدا جو رہ گئے ہیں۔ ان کو ہوا کا
رُخ اپنے زبردست اثر سے گرد و غبار میں ملائے گا۔ مبارک ہیں

وہ لوگ جن کو شاعری جیسی نعمت نصیب ہو۔ اور اس سے بھی زیادہ قابل مبارکباد وہ لوگ ہیں۔ جو شاعری کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔ اور الشعراء تلامیذ الرحمٰن کے مستحق قرار پاتے اور اپنی شاعری سے مردہ قوموں میں روح اور ذی روح قوموں میں ایک انقلاب ڈالنے والی حرکت پیدا کر سکتے ہیں۔

تمام شد

باہتمام لالہ دولت رام پرنٹر ہندوستان پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپی

حالات لاہور کے متعلق کتابیں

از تصنیفات منشی محمد الدین صاحب فوق

شالامار باغ نو ترمیم ملک سلسلہ جدید کا پہلا ایڈیشن۔ اس کتاب کو صرف باغ شالامار کی داستان نہ سمجھو۔ اس کے مطالعہ سے شائقین تاریخ کو تاریخی آگاہی، قومی مرثیہ پڑھنے والوں کو حسرت کا دفتر اور اہل بصیرت کو ادب و عبرت حاصل ہوتا ہے۔ علاوہ لاہور کے شالامار کے کشمیر، دہلی اور دیگر مقامات کے شالامار باغات کا تذکرہ بھی درج ہے۔ ہندوستان کی اسلامی عمارات کے متعلق ایک معتبر تاریخی تالیف تسلیم کیا گیا ہے۔ قیمت ۸؍

علمائے لاہور لاہور کے ان بزرگ ہستیوں کے حالات جو علمی و صوفیانہ حلقوں میں سعدی، جامی اور بایزید بن کر چمکے۔ اکثر نے اپنے علم و فضل کی پیشانی کو شاہان وقت کی چوکھٹ سے بچائے رکھا۔ قیمت دس آنہ

تذکرہ صوفیائے لاہور اس کتاب کا نام یاد رفتگان بھی ہے۔ اس میں مشہور بزرگان لاہور کے حالات مع ان کے مزارات درج ہیں۔ ڈاکٹر سر اقبال اور خواجہ حسن نظامی نے اس کو روحانی گائیڈ قرار دیا ہے۔ قیمت صرف ۱۲؍

حیات داتا گنج بخش حضرت علی ہجویری عرف حضرت داتا گنج بخش لاہوری کی عالمانہ صوفیانہ سیاحانہ اور تبلیغی زندگی۔ غزنوی عہد حکومت کے سب سے بڑے مبلغ اسلام کے حالات جن کے مزار پر انوار پر حضرت خواجہ معین الدین اجمیری اور بابا فرید شکر گنج جیسے صوفیائے کرام معتکف رہ چکے ہیں۔ قیمت [illegible]

تذکرہ قدیم شعرائے لاہور غزنویہ، مغلیہ اور سکھوں کے عہد میں لاہور میں جس قدر فارسی اور اردو کے شعرا گزرے ہیں ان کا دلچسپ تذکرہ مع ان کے چیدہ چیدہ کلام کے۔ قیمت [illegible]

لاہور عہد مغلیہ میں ہمایوں سے لیکر محمد شاہ کے زمانہ یعنی سوا دو سو سال تک لاہور کو شاہی باغات، عمارات اور اندرون و بیرون شہر کی رونق، آبادی اور کثرت تمول، فارغ البالی سے جو عروج و شباب حاصل رہا ہے اس کی مفصل کیفیت، عہد مغلیہ کے عدل و انصاف اور مغل گورنران لاہور کے دلچسپ کوائف، اس عہد کے علما امرا وزرا اور شہزادوں کے حالات۔ قیمت صرف ۸؍

کتابیں ملنے کا پتہ

ظفر برادرس تاجران کتب ظفر منزل لاہور